نگار

قیمت فی کاپی ۱۰ر

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت تین روپیہ

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسن زبان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا ہر افسانہ اور ہر مقالا اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت چار روپیہ

علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جسمیں تاریخ اور انشا لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں، حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

مختارات نیاز

حضرت نیاز فتحپوری کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ، اس میں اکثر و بیشتر وہ وہ افسانے شامل ہیں جو دوسری زبانوں سے لئے گئے ہیں اور اپنی دلچسپی و افادیت کے لحاظ سے خاص درجہ رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ دوسرے زبانوں کے افسانے کیونکر اپنی زبان میں لینا چاہئے کہ وہ ترجمہ نہ معلوم ہوں، مجلد، نہایت عمدہ طباعت و کاغذ و نفیس گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ

مکتوبات نیاز

دو حصوں میں

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل نیلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، اس اڈیشن میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۶ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوا ہے۔

قیمت ہر حصہ تین روپیہ

علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخیل اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مجموعۂ استفسار و جواب

(حصہ ۲ - ۳)

اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بے کار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اس کی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ

علاوہ محصول

جھانسی کی رانی

نیاز فتحپوری کے قلم سے اس ڈرامہ سے نہ صرف ۱۸۵۷ء کے ان واقعات پر روشنی پڑتی ہے جو ہندوستان میں برطانوی راج کے قیام کا باعث ہوئے، بلکہ راجاؤں کے ان اندرونی اختلافات کا بھی حال معلوم ہوتا ہے جو ملک کو غیر ملکیوں کے ہاتھ میں دیدینے کا بڑا سبب تھے اس ڈرامہ کے وہ حصے خصوصیت کے ساتھ بہت دلچسپ ہیں جن میں رانی کی زندگی کے آخری لمحات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ

اصحاب کہف

یہ ڈرامہ ایک مصری انشا پرداز "توفیق الحکیم" کی کتاب "اہل الکہف" کا ترجمہ ہے۔ جس میں فاضل مصنف نے نہایت لطیف انداز سے "اصحاب کہف" کی روایت پر عاقلانہ تبصرہ کیا ہے، اس تمثیل کی جان وہ حصہ ہے جہاں موضوع محبت پر گفتگو کی گئی ہے اور اس کی ابدیت کو بالکل اچھوتے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ ترجمہ حضرت نیاز نے کیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ

زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہئے

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں

چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دنیا آج کل اسے

نکٹائی مارکہ

مال استعمال کرکے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ، مشکی قوام، دانہ الائچی، تیل، عطر، عرق کیوڑہ و گلاب اور مختلف قسم

کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا

مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے

فہرست طلب فرمائیے

ٹیلی گرام: "مشکی قوام ہوڑہ"

ٹیلی فون: "ہوڑہ ۴۵۵"

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری - ۱۴۱ ہوڑہ روڈ - ہوڑہ

فاسد مادہ کے بغیر
جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے
خون صاف رکھنا نہایت ضروری ہے

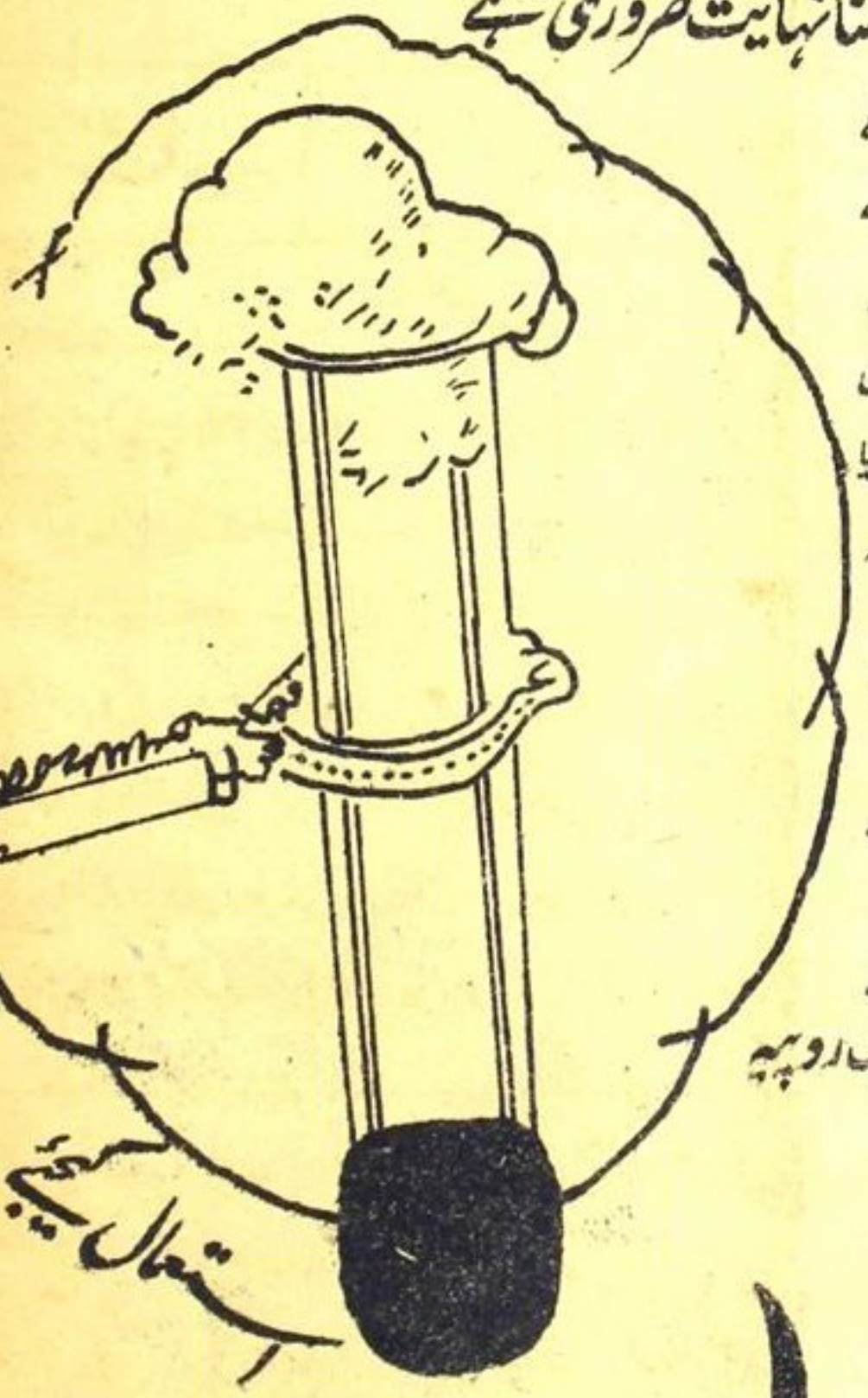

قدیم یونانی نظریہ کی تائید میں جب ڈاکٹر اسپیکو فریر پروفیسر ویانا یونیورسٹی نے فیصلہ کر لیا کہ مادہ کے بغیر جراثیم مرض پیدا نہیں کر سکتے تو ایک دن انھوں نے ایک عجیب و غریب مظاہرہ کیا وہ کلاس پڑھا رہے تھے، انکے ہاتھ میں ایک ٹیسٹ ٹیوب تھی جس میں ہیضہ کے زندہ جراثیم موجود تھے، جو ایک پوری رجمنٹ کو ہلاک کرنے کے لئے کافی تھے۔ ڈاکٹر نے ان سب جراثیم کو نگل لیا مگر اس خطرناک تجربہ کا نتیجہ سوائے ہلکی سی تکلیف کے اور کچھ نہ ہوا، آخر کیوں؟ ہیضہ کے زندہ جراثیم نے ڈاکٹر کو ہلاک کیوں نہیں کر ڈالا! صرف اس لئے کہ ڈاکٹر کا خون فاسد مادوں سے صاف تھا

اور یہی ڈاکٹر کا دعویٰ تھا

یقیناً جراثیم کو مارنا قطعاً غلط ہے، اصل چیز جسم و خون کو فاسد مادوں سے صاف رکھنا ہے۔ **صافی** اسی اُصول کے پیش نظر طیار کی گئی یہ خون کو صاف رکھتی ہے اور جسم کی قوت مدافعت کو مرض کے خلاف قوی رکھتی ہے

قیمت فی شیشی ایک روپیہ

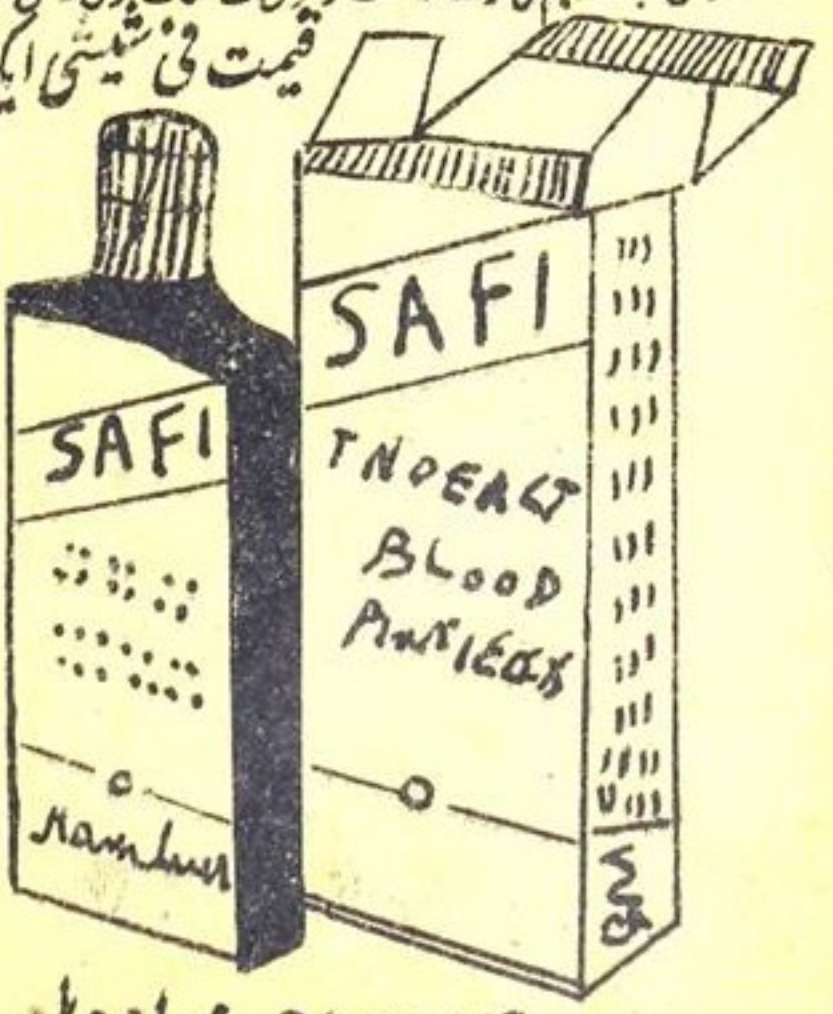

صافی

Hamdard

ہمدرد دواخانہ دہلی

خون صاف کرنے کی قدرتی دوا

سالانہ چندہ: چھ روپیہ ہندوستان کے لئے

نگار

بیرونِ ہند کے لئے بارہ روپیہ

جلد ۵۳ | مضامین مئی سنہ ۴۸ء | شمار ۵

ملاحظات ---------- ۴
دیوان ذوق میں مولانا آزاد کے اضافے... پروفیسر محمود شیرانی (مرحوم) ۹
راشٹریہ سوایم سیوک سنگھ ---------- ۱۷
انشا ایک نثار اور ماہر لسانیات کی حیثیت سے... رحمت نبی خاں ایم اے ۲۱
ترکی، امریکہ کی سامراجی گرفت میں ---------- ۲۶
شرم وحیا کا فلسفہ ---------- محمد ضمیر عالم --- ۲۸
عہد حاضر کا قارون (امریکہ) ---------- ۳۷
ہر بات کا جواب دینے والے انسان ---------- ۴۰
مکتوبات نیاز ---------- ۴۳
باب الانتقاد (روپ میری نظر میں) مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی ۴۶
مالہ وماعلیہ ---------- ۵۶
معلومات عامہ ---------- ۵۹
منظومات --- قہر اکبر آبادی... ناظر کاظمی --- ۶۱
بیاض نیاز (بیدل) ---------- ۶۲
مطبوعات موصولہ ---------- ۶۳

حضرت نیاز فتحپوری کی ایک بے مثل تصنیف

"من ویزداں"

جو اپنی انشاء عالیہ اور پرزور خطیبانہ تحریر کے لحاظ سے معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتی ہے ——— اور اخلاقی تعلیمات کے لحاظ سے اتنی بلند ہے کہ اُسے صحیح معنے میں

انجیلِ انسانیت

کہہ سکتے ہیں۔

اس میں مذاہب کی تخلیق، خدا کے تصور، رسالت کے مفہوم، دینی عقاید اور کتب الہامی کی حقیقت پر بسیط تاریخی علمی، نفسیاتی اور اخلاقی بحث کی گئی ہے۔ حجم ۲۷۲ صفحات۔ کاغذ سفید و دبیز۔ جلد خوشنما۔

قیمت علاوہ محصول سات روپیہ آٹھ آنے (معہ) ——— مینجر نگار۔ لکھنؤ

ملک خطا کے شہزادے

اگر آپ نے اب تک مطالعہ نہیں فرمایا، تو اب طلب کر لیجے
انشاء پردازی کا وہ خاص نمونہ جو آپ کو کسی دوسری
کتاب میں نہیں ملسکتا۔ قیمت معہ محصول ایک روپیہ

مذہب اور فلسفۂ مذہب

دونوں معہ محصول
دو روپئے میں

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۵۳	مئی سنہ ۱۹۴۸ء	شمار ۵

ملاحظات

ایران کا مستقبل

پچھلی جنگ میں ایران نے کوئی عملی حصہ نہیں لیا، لیکن وہ اپنی غیر جانبداری کی حالت میں بھی فکر و تشویش سے خالی نہیں رہا، کیونکہ ایران ہمیشہ روس و برطانیہ کی باہمی رقابت کا سبب رہا ہے اور جب جنگ کے آخری دور میں اُس کو روس کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے ایران پر برطانوی فوجوں نے تسلط قایم کیا تو ایران کو اس کا بالکل یقین ہوگیا کہ روس و برطانیہ کے دو پاٹوں کے درمیان اسے کسی نہ کسی دن پسنا ہے۔

آجکل کسی ملک کی جغرافی پوزیشن کو بڑی اہمیت حاصل ہے، یعنی اگر وہ اپنی جاء وقوع کے لحاظ سے بحری یا ہوائی مرکز بننے کے لئے موزوں ہے یا اپنی معدنی و پٹرولی پیداوار کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے، تو پھر دوسرے ممالک ایسے ملک پر اپنا تسلط قایم کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، کیونکہ بصورت جنگ اس کی جغرافی پوزیشن و معدنی زرخیزی کامیابی کی راہ میں بہت معاون ثابت ہوسکتی ہے۔ پھر چونکہ ایران بھی اپنی جاء وقوع اور پٹرولی چشموں کے لحاظ سے روس و برطانیہ دونوں کے لئے اہم ہے۔ اس لئے ہر وقت اسے خطرہ لگا رہتا ہے کہ معلوم نہیں کس وقت روس و برطانیہ کا تصادم اسے تباہ و برباد کر دے۔

اس میں شک نہیں کہ ایران کے لئے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ وہ ان دونوں طاقتوں میں سے کس کا ساتھ دے، اور اسی تذبذب کی وجہ سے اس نے پہلے اپنے پٹرولی چشموں کا ٹھیکہ روس کو دینا منظور کیا تھا اور بعد کو اس وعدہ سے پھر گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۳۱ جنوری کو روس نے ایک احتجاجی نوٹ ایران کو بھیجا کہ اس کا یہ طرز عمل سنہ ۱۹۲۱ء کے اس معاہدہ

دوستی کے بالکل خلاف ہے جو ایران و روس کے درمیان ہوا تھا اور اس معاہدہ کی رو سے روس کو حق حاصل ہے کہ اگر اندرونِ ایران کی طرف سے کوئی خطرہ روس کو پیدا ہو تو وہ ایران پر قبضہ کر لے۔"

حال ہی میں ماسکو ریڈیو نے اعلان کیا ہے کہ اگر امریکہ نے خلیج فارس میں بحری فوجی مشق کے لئے کوئی جہاز روانہ کیا (جیسا کہ بی۔بی۔سی سے معلوم ہوا ہے) تو وہ ۱۹۲۱ء کے معاہدہ پر عمل کرنے سے باز نہ رہے گا۔ ہر چند ایران نے اسکا جواب یہ دیا کہ خلیج فارس میں امریکہ کے کسی جہاز کو فوجی مشق کی اجازت نہیں دی گئی، لیکن روس، ایران کے موجودہ رجحانات سے بے خبر نہیں ہے اور وہ جانتا ہے کہ حال ہی میں ایران نے دس کروڑ ڈالر کا سامانِ جنگ امریکہ سے حاصل کیا ہے جس کا مقصود یہ ہے کہ روس کی طرف اپنی سرحد کو مضبوط بنائے اور اسی لئے شمالی ایران میں وہ کمیونسٹ تحریک کو روز بروز قوی بناتا جا رہا ہے۔

خود ایران کی انتظامی حالت بہت خراب ہے، اس دوران میں بارہا وزارتیں بدلیں، لیکن چونکہ خود اہلِ ایران کے درد و دکھ کا خیال کسی ملک نے نہیں کیا اور نہ ملک کی اقتصادی تباہیوں کی طرف توجہ کی گئی، اس لئے کوئی حکومت کامیاب نہیں ہوئی۔ ان وزارتوں کی خود غرضی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قوام السلطنت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسنے پٹرول کا ٹھیکہ دینے میں لاکھوں پونڈ کی رشوت لی اور ملک کے مفاد و اغراض کو بالکل پس پشت ڈال دیا۔ الغرض ایران کا مستقبل اسوقت بڑے خطرہ میں ہے اور اگر روس و امریکہ میں جنگ ہو گئی تو اس کا وہی حشر ہو گا جو پولینڈ کا ہوا تھا، اور قبل اس کے کہ امریکہ اس کی مدد کرے، روس اسے پامال کر کے رکھدے گا، لیکن سوال یہ ہے کہ ایران اس خطرہ سے محفوظ کیونکر رہ سکتا ہے! ایکطرف کمیونسٹ تحریک وہاں قوی ہوتی جا رہی ہے، دوسری طرف برطانوی و امریکی ریشہ دوانیاں اپنا کام کر رہی ہیں اور ایران ان میں سے کسی پر قابو نہیں پا سکتا، اس لئے اگر اس نے جنگ کا انتظار کیا تو اخیر میں روس کامیاب ہو یا امریکہ، ایران کا ختم ہو جانا بالکل یقینی ہے۔ اب رہا یہ کہ اس مصیبت کے آنے سے پہلے ہی اس کو کیا کرنا چاہئے، سو اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ حکومت امرا کے ہاتھ سے چھین کر عوام کے ہاتھ میں دیدی جائے اور اگر وہ چاہیں تو ایران کو سوویٹ یونین میں شامل کر دیں۔

فلسطین اور مشرقِ وسطیٰ

فلسطین میں برطانوی انتداب بہت جلد ختم ہونے والا ہے اور اب وہ کسی شرط کے ساتھ یہاں اپنی فوجوں کو رکھنا پسند نہیں کرتا، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ عربوں اور یہودیوں کے جھگڑے طے نہیں ہو سکتے اور اپنی فوجوں کو یہاں پھنسائے رکھنا کوئی مفید سودا نہیں ہے ——— ہر چند عرب و یہود کے اختلاف کی بنیاد برطانیہ ہی نے ڈالی تھی اور اس نے ایک بار عربوں کا اور دوسری بار یہودیوں کا ساتھ دیکر معاملات کو پیچیدہ بنایا، لیکن اب وہ چنگاری ڈالنے کے بعد اس آگ کا تماشہ دور سے دیکھنا چاہتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا بصورتِ جنگ اس کی حیثیت واقعی صرف تماشائی کی سی رہے گی اور اس کو اس آگ میں نہ کودنا پڑے گا۔

حالات بتاتے ہیں کہ اگر یہ جنگ یہود و عرب تک محدود نہ رہی، بلکہ دوسری قومیں بھی اس میں شریک ہوئیں، جس کا قوی امکان ہے، تو یہ آگ برطانیہ کیا ساری دنیا میں پھیل جانے والی ہے اور کسی ملک کا اس سے دامن بچا کر گزر جانا مشکل ہے۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ایک طرف عرب لیگ جنگ کے لئے طیار ہے اور دوسری طرف یہودی جماعت بھی نہ صرف مدافعت بلکہ حملہ کے لئے آمادہ ہے اور گو کثرت آبادی کے لحاظ سے پلّہ عربوں کا بھاری ہے، لیکن ان کی فوجی قوت بالکل غیر منظم ہے، برخلاف اس کے یہود گو کم ہیں لیکن جنگی طیاری کے لحاظ سے وہ بہت قوی ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ حیفہ کا بندرگاہ جو نہایت اہم مقام تھا انھوں نے عربوں سے چھین لیا۔ اول تو خود یہودیوں کی فوج کا بہت بڑا حصہ آزمودہ کار سپاہیوں اور افسروں پر مشتمل ہے، دوسرے روسی افسران بھی انکا ساتھ دے رہے ہیں۔ رہا سامانِ جنگ سو وہ بھی کثرت سے ان کو اٹلی وغیرہ کی طرف سے فراہم ہو رہا ہے۔ الغرض یہودیوں کا پلّہ ہر حیثیت سے بھاری ہے اور عربوں کی کامیابی کا بہت کم امکان ہے۔ لیکن اس کے معنے یہ نہیں کہ یہودیوں کو فلسطین پر قبضہ کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے گا اور یہ لڑائی محض یہود و عرب تک محدود رہے گی۔

حفاظتی کونسل بہت کوشش کر رہی ہے کہ ان دونوں میں صلح ہو جائے، لیکن اس کا بظاہر کوئی امکان نہیں، کیونکہ عرب لیگ کی طرف سے صلح کی اولین شرط یہ پیش کی گئی ہے کہ حفاظتی کونسل اس کی ذمہ داری لے کہ اب باہر کا ایک یہودی بھی فلسطین میں داخل نہ ہوگا اور اس بات کی ذمہ داری لینا اس کے امکان میں نہیں۔

امریکہ پہلے تقسیم فلسطین چاہتا تھا، لیکن اب یہ تجویز اس نے واپس لے لی ہے، برخلاف اس کے روس تقسیم کا طرفدار ہے اور اس طرح ایران کی طرح یہاں بھی وہی روس و امریکہ کی باہمی رقابت کام کر رہی ہے۔ ہر چند یہ مسئلہ اب جنرل اسمبلی کے سامنے پیش ہونے والا ہے، لیکن ڈر ہے کہ جنرل اسمبلی میں اس مباحثے کے ختم ہونے سے پہلے ہی یہ آگ کہیں تمام مشرق وسطیٰ میں نہ پھیل جائے اور دُنیا پر پھر ایک بار جہنم کا دروازہ کھُل جائے۔

روس کا نقطۂ نظر جرمنی پر

جنگ سے قبل سوویٹ حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ وہ ساری دُنیا کو اشتراکیت کی دعوت دے رہا تھا اور کسی غیر اشتراکی حکومت سے رابطۂ اتحاد قایم نہ کرنا چاہتا تھا، لیکن جنگ کے بعد جب اسے دوسرے ملکوں سے مدد حاصل کرنے کی ضرورت ہوئی تو اس نے اپنی یہ پالیسی بدل دی اور اعلان کر دیا کہ یوروپ کی کمیونسٹ جماعتیں، دوسری قومی جماعتوں کے ساتھ ملکر کام کر سکتی ہیں اور سوویٹ حکومت زبردستی اشتراکیت کے نفوذ کی حامی نہیں ہے۔ روس کا مقصود اس سے یہ تھا کہ وہ اس طرح آہستہ آہستہ کمیونسٹ جماعتوں کو یوروپ پر چھا جانے کا موقعہ دے، چنانچہ ۱۹۴۷ء تک اس کی اس پالیسی نے اس قدر کامیابی حاصل کر لی کہ ہنگری، بلغاریا، رومانیا اور پولینڈ ہر جگہ خالص کمیونسٹ حکومتیں قایم ہو گئیں، لیکن مغربی یوروپ میں اس کی یہ تدبیر ناکام رہی اور فرانس و اٹلی میں کمیونسٹ وہاں کی حکومتوں پر قبضہ نہ کر سکے، اسی کے ساتھ امریکہ نے مارشل پلان کا اعلان کر دیا اور روس کی امیدیں مغربی یوروپ میں تقریباً ختم ہو گئیں — سوویٹ حکومت نے یہ رنگ دیکھ کر پھر اپنی پالیسی بدل دی اور اعلان کر دیا کہ وہ ملی جلی حکومتوں کے قیام کو پسند نہیں کرتا بلکہ خالص اشتراکی حکومت کا حامی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلغاریا، رومانیا اور

زیکوسلاویکیا وغیرہ میں جہاں جہاں ملی جلی حکومت تھی اشتراکی آمریت کا دور شروع ہوگیا۔

روس نے اسی کے ساتھ یہ بھی سوچا کہ اب اپنے اثرات وسیع کرنے کی جگہ زیادہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں جہاں اس کا تسلط قایم ہوگیا ہے، اسی کو مستحکم بنایا جائے اور چونکہ جرمنی کو وسط یوروپ میں کلیدی حیثیت حاصل ہے اس لئے وہاں جرمن کمیونسٹ پارٹی کو قوی بناکر اشتراکی گرفت کو شدید کردیا جائے، لیکن اس تدبیر میں بھی اسے کامیابی نہیں ہوئی، کیونکہ خود مشرقی جرمنی میں بھی جہاں روس کا قبضہ ہے، کمیونسٹ جماعت کو پسند نہیں کیا جاتا، چہ جائیکہ دوسرے حصے جہاں فرانس، برطانیہ اور امریکہ کا تسلط ہے، علاوہ اس کے امر بھی مشتبہ ہے کہ نازی تحریک فنا ہوچکی ہے اور اب اس کے ابھرنے کا امکان نہیں۔ چنانچہ بعض معتبر ذرایع سے معلوم ہوا ہے کہ مارٹن لوبرمن جو ہٹلر کے زمانہ میں نازی جماعت کا ڈپٹی لیڈر تھا ابھی تک نہ صرف زندہ ہے بلکہ سویڈن میں نازی تحریک کو بڑی قوت سے چلا رہا ہے اور جرمنی کے بہت سے شہروں میں خفیہ طور پر یہ جماعت مختلف قسم کے اسلحہ طیار کر رہی ہے۔ یہ تحریک سویڈن کے علاوہ جنوبی امریکہ میں بھی پھیلتی جارہی ہے اور سویڈن، پرتگال، اسپین اور سوئٹزرلینڈ کے مختلف بنکوں میں تقریباً ۸۰ کرور ڈالر نازیوں کا اب بھی موجود ہے، الغرض روس کی پالیسی اس حد تک تو ضرور کامیاب ہے کہ وسط یوروپ کا بڑا حصہ اس کے زیر اثر آگیا ہے۔ لیکن امریکہ کی دولت کے سامنے جسے وہ پانی کی طرح بہا رہا ہے، یہ امید بہت کم ہے کہ مغربی یوروپ کو بھی وہ اپنے اثر میں لے آئے گا اور جرمنی کی تمام آبادی کو وہ کمیونسٹ خیال کا بنا دے گا۔ تاہم اسی کے ساتھ یہ بھی بالکل یقینی ہے کہ جب تک جرمنی کی اقتصادی حالت درست نہ ہو امریکہ و برطانیہ بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتے لیکن امریکہ و روس کی موجودہ کشیدگی اس وقت تک جنگ کی صورت اختیار نہیں کرسکتی ——————

—————— جب تک ان دونوں کا توازنِ قوت یکساں ہے چنانچہ یہ دونوں اسی کوشش میں ہیں کہ کسی طرح ان کا پلّہ بھاری ہوجائے اور جس وقت ان میں سے کسی ایک کا پلّہ بھاری ہوا تو فوراً جنگ شروع ہوجائے گی یا قوی ملک اپنے حریف سے اپنی من مانی شرطیں تسلیم کرالیگا۔

پاکستان و ہندوستان

تقسیم ہند کے بعد سب سے پہلی امید افزا خبر یہ سننے میں آئی ہے کہ دونوں حکومتوں کے درمیان بعض بنیادی مسایل پر مفاہمت ہوگئی ہے اور کلکتہ میں یہ کانفرنس خوشدلی کے ساتھ شروع ہوئی اور کامیابی پر ختم ہوئی۔ اس مفاہمت کا روشن ترین پہلو یہ ہے کہ دونوں حکومتوں نے اصولاً اس بات کو تسلیم کرلیا ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت ان کا فرض اولین ہے اور اگر واقعی اس پر عمل کیا گیا تو آپس کی بہت سی بدگمانیاں دور ہوجائیں گی اور ہجرت کی بلا جس نے ہندوستان کو کم اور پاکستان کو نسبتاً زیادہ پریشان کر رکھا ہے، دور ہوجائے گی۔

اسی کے ساتھ دوسری خبر یہ ہے کہ قایداعظم نے سندھ کے وزیراعظم کو معزول کرکے ان کی بدعنوانیوں کے خلاف

تحقیقات کا حکم دیا ہے۔ اس وقت تک سندھ کے جو حالات ہم تک پہونچے ہیں، ان کا اقتضاء یہ تھا کہ جو قدم اب اُٹھایا گیا ہے وہ اس سے قبل ہی اُٹھنا چاہئے تھا، لیکن اصلاح کا خیال خواہ دیر میں ہو یا جلد بہرصورت قابل مبارکباد ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ اس کا اثر وہاں کے عام انتظامی حالت پر بہت اچھا پڑے گا۔

قاسم رضوی اور اچاریہ کرپلانی اس دوران میں قاسم رضوی صاحب صدر اتحاد المسلمین حیدرآباد کی ایک تقریر بعض اخباروں میں شایع ہوئی ہے، جس کو انڈین یونین کے خلاف کھلے ہوئے اعلانِ جنگ کی حیثیت سے دیکھا گیا ہے، لیکن اس کا جو ردِّ عمل اچاریہ کرپلانی پر ہوا ہے، وہ قاسم رضوی صاحب کے بیان سے زیادہ قابلِ ملامت ہے۔

قاسم رضوی صاحب اور حکومت حیدرآباد نے اس خبر کی تردید کی ہے اور اس کو مخالفانہ پروپاگنڈا بتایا ہے، لیکن اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ مان بھی لیں کہ صدر اتحاد المسلمین نے واقعی وہی کہا تھا جو بعض اخبارات میں ظاہر کیا گیا ہے، تو بھی اچاریا کرپلانی ایسی شخصیت کو جو عرصۂ دراز تک مہاتما گاندھی کی صحبت سے مستفید ہوتی رہی ہے اور جو کانگرس ایسی مقتدر جماعت کا صدر رہ چکی ہے، کبھی اپنی زبان سے وہ نہ کہنا چاہئے تھا جو انھوں نے کہا۔

اگر ان کا مشورہ صرف اس قدر ہوتا کہ سربرآوردہ مسلمانانِ ہند، حیدرآباد جاکر وہاں کے حالات اور اتحاد المسلمین کی تحریک کی نوعیت کا مطالعہ کریں تو کسی کو اعتراض نہ ہو سکتا تھا، لیکن ان کا یہ کہنا کہ اگر انھوں نے اسوقت حیدرآباد پہونچکر اتحاد المسلمین کی تحریک کا مقابلہ نہ کیا تو اُن کی وفاداری مشتبہ رہے گی، حد درجہ غیر سنجیدہ، عامیانہ اور سطحی ذہنیت کو ظاہر کرتا ہے۔

افسوس ہے کہ مسٹر اچاریا کرپلانی کو نفسیات کے اس معمولی نکتہ کا بھی علم نہیں کہ بے اعتمادی کا اندیشہ اسی دل میں زیادہ پیدا ہوتا ہے جو خود دوسروں کا اعتماد حاصل نہیں کر سکتا اور اس طرح قبل اس کے کہ وہ مسلمانوں کی وفاداری کا امتحان لیں انھیں خود یہ ثابت کرنا چاہئے کہ وہ خود کس حد تک فرقہ وارانہ ذہنیت سے پاک ہیں اور مسلمان کیونکر یقین کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی وفاداری کا مفہوم ان کے یہاں غلامی اور قومی خودداری کی قربانی کے سوا کچھ نہیں۔

ارژنگ

حضرت نیاز فتحپوری کی پوری ادبی زندگی اور انشا پردازانہ سحرکاریوں کا بے مثل مرقع
نہایت نفیس کاغذ پر زیر طبع ہے ——— قیمت چار روپیہ

منیجر نگار۔ لکھنؤ

دیوان ذوق میں مولانا آزاد کے اضافے

(بہ سلسلۂ ماسبق)

غزل دوم یہ غزل مذکورۂ بالا انجمن اس (اسکاچ مشن سیالکوٹ) کے مضمون و تعلیم کے پہلے صفحے کی پشت پر درج ہے اس میں کاٹ چھانٹ اور قطع و برید بکثرت ہے۔ بعض اشعار پشت پر بنائے گئے اور مسودے کے صفحے پر لاکر پیران میں ردو بدل کیا گیا ہے۔ ایک ہی شعر کی اصلاح کئی کئی ٹکڑوں میں مختلف مقامات پر بکھری ہوئی ہے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس شعر میں جو جو تغیرات مسودے کے دوران میں داخل ہوئے ہیں، ان کو ایک ہی مقام پر بالالتزام تقدم و تاخیر ضبط کر دوں البتہ پشت کا مسودہ مقدم اور اصل مسودہ موخر دکھایا ہے ——— مقطع اور دیدۂ شعر کا پہلا بھی شامل کر دیا ہے۔

"اللہ و علی" "سبحانہ"

پہلا شعر ابتدائی فرد کے اوپر درج تھا۔ بعد میں مضمون بدل کر مطلع کر دیا گیا۔

پشت مسودہ ؎

تری آنکھوں کے فتنے شہر و بن عالم میں ہوتے ہیں — ہوئے فتنے آنکھوں سے ایسے کہاں ایسے نہ ہوتے

ہمیشہ عرصۂ عالم ہوئے جو فتنے اب ہوئے اس سے فتنہ گر

~~ہمیشہ حشر بپا تجھ سے تری تگ~~

پہلا ؎ پر پر و کیا ستمگر بیشتر ایسے نہ ہوتے تھے — ولیکن جیسے تم ہو فتنہ گر ایسے نہ ہوتے تھے

دیوان ؎ پر پر و کیا ستمگر بیشتر ایسے نہ ہوتے تھے ولیکن جیسے تم ہو فتنہ گر ایسے نہ ہوتے تھے (ص ۱۰۹)

پشت ؎ وہ گیسو جب پریشاں رات بھر ایسے نہ ہوتے — نسیم زلف کے جھونکے سحر ایسے نہ ہوتے

~~وہ گیسو پر پریشاں رات بھر ایسے نہ ہوتے تھے~~

وہ گیسو کھل کے جب رات بھر ایسے نہ ہوتے تھے

جب اپنے گھر وہ کھل کر رات بھر ایسے نہ ہوتے تھے

تم اپنے گھر جو کھل کر رات بھر ایسے نہ ہوتے تھے

ادھر کھل کر جو ——— تم رات بھر ایسے نہ ہوتے

~~ادھر ــــــ کھل کر جو تم~~ ~~ادھر دل کھول کر جب رات~~

کھلے جب اپنے گھر تم رات بھر ایسے نہ ہوتے تھے — نسیم صبح کے جھونکے ادھر ایسے نہ ہوتے تھے

~~تم رات بھر جب اپنے گھر ایسے نہ ہوتے تھے~~

اصل مسودہ ۔ گوشۂ چپ میں جانب زیریں

اصل ؎ اُدھر تم بے تکلف کھل کے گر ایسے نہ ہوتے تھے — نسیم صبح کے جھونکے ادھر ایسے نہ ہوتے تھے

مطلع کے بعد:- ؎ وہ گھر جب بے تکلف رات بھر ایسے

~~جب اپنے گھر وہ کھل کر رات بھر ایسے نہ ہوتے تھے~~ — نسیم صبح کے جھونکے ادھر ایسے نہ ہوتے تھے

حاشیے میں جانب راست :-

جو گھر تم بے تکلف رات بھر

~~جو وہاں تم بے تکلف رات بھر ایسے~~

وہ جب گھر اپنے کھل کر رات بھر

وہ جب دل کھول کر وہاں رات بھر

دیوان ؎ وہ جب واں بے تکلف رات بھر ایسے نہ ہوتے تھے — صبا کے جھونکے یہاں وقت سحر ایسے نہ ہوتے تھے (ص ۲۲۹)

اصل مسودہ ؎ کسی کی فندقیں یاد آگئیں ہیں ورنہ مژگاں پر — نمایاں قطرۂ خون جگر ایسے نہ ہوتے تھے

دیوان ؎ کسی کی فندقیں یاد آگئیں ہیں ورنہ مژگاں پر — نمایاں قطرۂ خون جگر ایسے نہ ہوتے تھے (ص ۲۲۹)

اصل ؎ جو دیں ہیں گالیاں اس بدزباں نے آج کیا کہئے — کبھی نادم ہم اُس کو چھیڑ کر ایسے نہ ہوتے تھے

دیوان ؎ جو دیں ہیں گالیاں اس بدزباں کو (کذا) آج کیا کہئے — کبھی نادم ہم اس کو چھیڑ کر ایسے نہ ہوتے تھے (ص ۲۲۹)

اصل ؎ خدنگ عشق کھا کر زخم دل فرہاد کے ہاہم — لگے کہنے کہ شیریں نیشکر ایسے نہ ہوتے تھے

دیوان ؎ خدنگ عشق کھا کر زخم دل فرہاد کے ہاہم — لگے کہنے کہ شیریں نیشکر ایسے نہ ہوتے تھے

پشت ؎ سفر ہے جان کا پیش نظر ــــــ سفر ہے سامنے جاں کا دلا

~~ابکہ ہے سفر ہے جاں کا اے دل~~ — پریشاں ہو نہ جوں گرد سفر ایسے نہ ہوتے تھے

~~سفر ہے اب کے جاں کا کیا کہیں حیراں ہیں کریں کیا ہم~~

~~سفر ہے اب کے جاں کا اس لئے ہیں دلمیں حیران ہم~~

پشت ؎ ~~سفر ہے جان کا لہٰذا ہم ہیں اس لئے حیراں~~ — ~~پریشاں ورنہ جوں گرد سفر ایسے نہ ہوتے تھے~~

سفر ہے جان کا ــــ ہم حیراں ــــ ~~سفر ہے جان کا تن سے~~

اصل ؎ سفر ہے ابکے ہے جاں کا دیکھیں کیا ہم بھی حیراں ہیں
~~سفر ہے ابکے جاں کا حضرت دل اب بھی حیراں ہیں~~
ہیں جبھی حیراں

سفر اب کے ہے جانکا حضرت دل بیٹھے حیراں ہیں — پریشاں ورنہ جوں گرد سفر ایسے نہ ہوتے تھے
~~سفر ہے جاں کا قالب سے ہم ہیں اس لئے حیراں~~

دیوان ؎ سفر اب کے ہے جانکا حضرت دل بیٹھے حیراں ہیں — پریشاں ورنہ جوں گرد سفر ایسے نہ ہوتے تھے

پشت ؎ کتاب دل ہے سوز عشق سے شاید بھڑک اٹھی
~~کتاب دل کو سوز عشق نے شاید جلایا ہے~~ — کہ مضموں سوز غم کے پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے

اصل ؎ کتاب دل ہماری شرار عشق سے ہے جل اٹھی شاید — کہ مضموں سوز غم کے پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے

دیوان ؎ کتاب دل شرار عشق سے ہے جل اٹھی شاید — کہ مضموں سوز دل کے پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے (ص ۲۲۹)

اصل ؎ میں آب ~~حیرت~~ ہے یا آبداری ہے
ہمارے آبلوں نے آب دی صحرا نوردی سے — کہ پہلے خار صحرا تیز تر ایسے نہ ہوتے تھے

دیوان ؎ ہمارے آبلوں میں آب ہے یا آبداری ہے — کہ پہلے خار صحرا تیز تر ایسے نہ ہوتے تھے

پشت ؎ اٹھائے عمر بھر ~~دل نے~~ دل پر ہیں دکھ درد جدائی کے
اٹھائے ہیں ستم دل نے ہزاروں — مگر صدمے ہماری جان پر ایسے نہ ہوتے تھے
ستم دیکھے ہیں دل نے عمر بھر — ستم دیکھا کیا دل عمر بھر
ستم دیکھے ہیں دل پر عمر بھر اے بیوفا — ستم دیکھے جو دل پر عمر بھر اے بیوفا دیکھے
ستم گزرے جو دل پر اے ستمگر عمر بھر گزرے — ستم گزرے جو دل پر اے ستمگر
ستم جو اے ستمگر گزرے اب تک دل پہ گزرے — ہوئے دل پر
ستم جو جو تھے دنیا کے ستمگر ہو گئے دل پر — ستم دنیا کے جو جو تھے ستمگر ہو گئے دل پر

اصل مسودہ - جانب چپ کنارے پر ؎
اٹھائے دکھ ہزاروں دل نے درد کے دل نے جدائی میں — مگر صدمے ہماری جان پر ایسے نہ ہوتے تھے
اٹھاتا دکھ بہت تھا دل مرا در
جو دکھ ہوتے تھے ہم پر ہجر میں سب تھے اٹھا لیتے
ہم پر تھے یا دل پر تھے مل جل کر گزر جاتے — مگر جو صدمے اب ہیں جان

~~جو دیکھے تھے ہم نے~~

سیدھی طرف وسط میں ؎ ستم دنیا کے جو جو تھے ستمگر ہو گئے دل پر

~~ستم دیکھے جو دل پر اے ستمگر عمر بھر دیکھے~~ مگر صدمے ہماری جان پر ایسے نہ ہوتے تھے

دیوان ؎ ستم دنیا کے جو جو تھے ستمگر دل پہ تم گزرے مگر صدمے ہماری جان پر ایسے نہ ہوتے تھے

مسودۂ اصل میں ایک شعر یوں رقم ہے :-

~~ترے کوچے میں رہتے تھے گزرتے اہل شرارت کے~~ ~~گر ہوتے میں جب شور و شر ایسے نہ ہوتے تھے~~

بعد میں کسی بنا پر اس شعر کو کاٹ کر اس کے قافیہ کو آنکھوں کے ساتھ نباہنے کی کوشش کی، آخر میں قامت، اختیار کیا۔

پشت ؎ زمانے میں بہت سے دیکھے ہیں محشر مگر ظالم تری آنکھوں سے جو ہیں شور و شر ایسے نہیں ہوتے تھے

~~زمانے میں بہت اے فتنہ گر دیکھے بپا محشر~~ ~~زمانے میں تگ و تاز میں دیکھے بہت دیکھے پر ایسے نہیں~~

اصل ؎ زمانے میں ہزاروں شور دیکھے سیکڑوں

~~زمانے میں ہمیشہ حشر برپا دیکھے پر ظالم~~ ~~زمانے میں ہمیشہ حشر و برپا دیکھے ہیں لیکن~~

ہمیشہ حشر زمانے میں بہت محشر بپا دیکھے ہیں پر ظالم تری آنکھوں سے ہیں جو شور و شر ایسے نہ ہوتے تھے

دیوان ؎ زمانے میں ہیں سنتے شور مدت سے قیامت کا پر اس قامت سے جو ہیں شور و شر ایسے نہ ہوتے تھے

مسودۂ اصل میں ایک اور شعر ہے جو دیوان سے خارج کر دیا گیا ہے ؎

پہ فیض اہل دل ہے ورنہ بیدل جس طرح بادل ہیں اب مفتوں تمہارے نام پر ایسے نہ ہوتے تھے

پھر اس میں ترمیم کر کے شعر بنانا چاہا، چنانچہ :- مسودۂ اصل ؎

تمام اہل سخن گرویدہ تھے اے ذوق پر جیسے ہیں اب مفتوں تمہارے نام پر ایسے نہ ہوتے تھے

~~تمہارے شعر کو سنتے تو سب تھے ذوق~~

~~تمہارے شعر پر مرتے تھے سب اے ذوق پر جیسے~~

~~سخن پر میرے سب گرویدہ تھے اے ذوق پر جیسے~~

~~تمہارے شعر پر گرویدہ سب تھے ذوق پر جیسے~~

~~ہمیشہ ذوق شیدا ہیں تمہارے شعر پر~~

~~تمہارے شعر کے شائق ہیں سب اے ذوق پر جیسے~~

~~سنکر ذوق جیسے بزم عالم میں~~

ہمارے شعر تر کو دیکھ کر بازار عالم میں ہوئے قائل میں سب اب اہل نظر ایسے نہ ہوتے تھے

دیوان ؎ ہمارے شعر سن کر ذوق جیسے بزم عالم میں ہوئے تائل یہیں اب اہل نظر ایسے نہ ہوتے تھے

غزل سوم

یہ غزل ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب کی چٹھی نمبر ۹۲ کی پشت پر ہے جو مولانا کو انجمن بادہ ہائی مارچ ۱۸۸۶ء کو بھیجی گئی تھی۔ چٹھی کے اوپر کے حصے کا بلاک جس میں مولانا کا نام درج ہے دیدیا جاتا ہے۔ اس میں ایک مصرع کا مسودہ بھی شامل ہے جو چار طرح سے کیا ہے۔ اس بلاک کے علاوہ پانچ شعروں کا اور بلاک بھی دیا جاتا ہے۔ اس غزل میں نسبتاً قطع و برید کم نظر آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مسودہ کی اور نذر ہو گا جو ہم تک نہیں پہونچا

اصل ؎ نہ دیں گواہی جو داغ کہن نہیں دیتے دکھائی کیا مرے تن پر چمن نہیں دیتے

دیوان ؎ نہ دیں گواہی جو داغ کہن نہیں دیتے دکھائی کیا مرے تن پر چمن نہیں دیتے

اصل ؎ جفا میں بات وہ کیا حکمۃً نہیں دیتے کہ درد جان ہمیں اب زخم تن نہیں دیتے

دیوان ؎ جفا میں بات وہ کیا حکمۃً نہیں دیتے کہ درد جاں ہمیں اب زخم تن نہیں دیتے

اصل ؎ جو بولوں کچھ تو مجال سخن نہیں دیتے ~~نہ بولوں میں~~ سیوں بھی میں پہ وہ سینے دہن نہیں دیتے

دیوان ؎ جو بولوں کچھ تو مجال سخن نہیں دیتے سیوں بھی میں۔ پہ وہ سینے دہن نہیں دیتے

پشت ؎ ہیں منع کرتے جو رونے کو ——— ہیں منع کرتے جو رونے جو بے درد

ہیں منع کرتے ہے جو رونے کو میرے ——— وہ کیا ہمدرد

یہ کیسے دوست ہیں رونے کو منع کرتے ہیں

اصل ؎ ~~یہ لوگ رونے کو ہر دم جو منع کرتے ہیں~~ ~~بجھائے کیوں مجھے دل کی جلن نہیں دیتے~~

ہیں منع کرتے ہے رونے کو میرے نادان دوست بجھائے کیوں مجھے دل کی جلن نہیں دیتے

دیوان ؎ ہیں منع کرتے ہے رونے کو یہ نادان دوست بجھائے کیوں مجھے دل کی جلن نہیں دیتے

اصل ؎ یہ پڑ گئیں تن لاغر میں جھرّیاں ہیں مرے کہ اتنے زلف میں بھی وہ شکن نہیں دیتے

دیوان ؎ یہ پڑ گئیں تن لاغر میں جھرّیاں ہیں مرے کہ اتنے زلف میں بھی وہ شکن نہیں دیتے

اصل ؎ شہید ناز کے چہلم پہ ہے نظر شاید کہ سرمہ آنکھوں میں تم جان من نہیں دیتے

دیوان ؎ شہید ناز کے چہلم پہ ہے نظر شاید کہ سرمہ آنکھوں میں تم جان من نہیں دیتے

اصل ؎ اجل ہے ڈھونڈتی مجھ کو گرفتگی یارو گھٹی ہیں پاتی

اجل ہے ڈھونڈتی پھرتی ولے ~~ہو~~ مرا پتا یارو بتا اُسے مرا بیت الحزن نہیں دیتے

دیوان ؎ اجل ہے پوچھتی پھرتی مرا پتا یارو بتا اُسے مرا بیت الحزن نہیں دیتے (ص ۲۲)

اصل ؎ میں ہے کچھ کچھ خطر کا گزر

دیوان ؎ عدم کی راہ میں بھی کچھ تو ہے خطر کا گزر — کہ ساتھ لینے بجز یک کفن نہیں دیتے

اصل ؎ جو مانگا آب دم تیغ اس سے بسمل نے — تو بولا کہا کہ زخمی کو اے خستہ تن نہیں دیتے

دیوان ؎ جو مانگا آب دم تیغ اس سے بسمل نے — تو بولا - زخمی کو اے خستہ تن نہیں دیتے

اصل ؎ بیان شیخ جو ہے وصف حور و حلۂ نور — ذرا دکھا اُسے اپنی پھبن نہیں دیتے

دیوان ؎ بیان شیخ جو ہے وصف حور و شعلۂ طور — ذرا دکھا اُسے اپنی پھبن نہیں دیتے

اصل ؎ وہ تیر کھینچے ہے پہلو سے کہدے اے دل زار — کہ ہے نشانی ناوک فگن نہیں دیتے

دیوان ؎ وہ تیر کھینچے ہے، پہلو سے کہدے اے دل زار — کہ ہے نشانی ناوک فگن نہیں دیتے

پشت ؎ ہو ان کی زلف سے کیا زخم دل کو چشم امید — لگا بھلے

اصل ؎ ~~ہے زخم سینہ پہ مرہم کی کیا امید اے دلا~~
~~وہ زخم سینہ پہ مرہم تو کیسے رکھیں گے~~
امید چارہ ہے کیا زخم دل کو زلفوں سے — لگا بھلے کو وہ مشک ختن نہیں دیتے

دیوان ؎ ہو ان کی زلف سے کیا زخم دل کو چشم امید — لگا بھلے کو وہ مشک ختن نہیں دیتے

اصل ؎ پڑے ہیں دامن کہسار و دامن صحرا — ~~کہ بعد مرگ بھی سینے~~ ترے شہید کو دو گز کفن نہیں دیتے

دیوان ؎ پڑے ہیں دامن کہسار و دامن صحرا — ترے شہید کو دو گز کفن نہیں دیتے

اصل ؎ زباں کو لطف و محبت کا نہیں ہے اثر — ~~زباں کو اپنی جو~~ منہ سے نکلے

زباں کو لطف و محبت کا گر نہیں ہے اثر — ~~لب اپنے منہ سے~~ سخن نہیں دیتے
لب اپنی حد سے گزرنے

دیوان ؎ زبان حلاوت الفت کا لے مزہ کہ نہ لے — لب اپنی حد سے گزرنے سخن نہیں دیتے

اصل ؎ پلایا زہر دکھا کر جو کر رہے مے کا پیمانہ — یہ دھوکے اے بت پیماں شکن نہیں دیتے

دیوان ؎ پلایا زہر دکھایا ہے مے کا پیمانہ — یہ دھوکے اے بت پیماں شکن نہیں دیتے

صفحے کے بائیں طرف وسط میں پائیں سے بالا کی طرف -

اصل ؎ ناخن وحشت کو اب تو دست جنوں — کہ سینے یہ مرا چاک کفن نہیں دیتے

دیوان ؎ سنبھال ناخن وحشت کہ اب تو دست جنوں — کہ سینے یہ مرا چاک کفن نہیں دیتے

اصل ؎ گلوں سے بن چکے جب دونو ہاتھ گلدستے تو بولے ذوق جلا تن بدن نہیں دیتے

دیوان ؎ گلوں سے بن چکے جب دونو ہاتھ گلدستے تو بولے ذوق جلا تن بدن نہیں دیتے

دیوان میں شعر ذیل زاید ہے :-

دیوان ؎ سحر ہے روز دکھاتا نئی چمک خورشید دکھا اُسے مرا داغ کہن نہیں دیتے (ص ۲۳۵)

میں اس قسط میں بخوف طوالت صرف ان پانچ غزلوں[1] پر قناعت کرتا ہوں۔ ان کی نقل لینے میں کافی احتیاط سے کام لیا ہے۔ الفاظ اور فقرے جس طرح اوپر نیچے سیدھے اُلٹے کاٹے یا بدلے گئے میں نے بھی اُنھیں اُسی طرح سے لکھا اور کاٹا ہے۔ حتی الامکان اصل کے مطابق نقل لینے کی کوشش کی ہے تاہم ایسے موقعے بھی بہت ہیں جہاں میں ہو بہو نقل لینے میں ناکام رہا ہوں۔ بعض مقامات پر قرأت مشکوک ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔

مولانا کا سرسبز تخیل اور اُن کی حاضر طبیعت قابل ستایش ہیں جب ہم متفرق فقروں اور مصرعوں کی متعدد قطاریں ان مسودوں میں دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے زور دماغ اور قوت فکر کے ذریعے سے ایک ادنیٰ خیال کو اعلیٰ پیرائۂ بیان عطا کر دیتے ہیں یہ غزلیں اگرچہ ذوق کی غزلوں کی روانی اور صفائی نہیں رکھتیں تاہم انکی پختگی اور متانت میں کوئی شبہ نہیں۔ حضرت مولانا نے پوری دماغ سوزی اور جگر کاوی سے انھیں طیار کیا ہے۔ بہت کم اساتذہ ان کی طبیعت کی تیزی اور ذہن کی براقی کو پہونچ سکتے ہیں۔

یہ کہنا کہ دیوان ہذا میں ان چودہ غزلوں کے علاوہ اور کس قدر تعداد غزلیات مولانا کی کاوش طبع کی ممنون ہے بہت دشوار ہے۔ البتہ اس قدر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی تمام غزلیں، جو ذوق کے رنگ میں نہیں نہ حافظ ویران کے ہاں موجود ہیں اور جن کو مولانا اُستاد کے کلام سے یاد کرتے ہیں، شک و شبہ کی مرکز ہیں۔ مثلاً گزشتۂ بالا چودہ غزلوں کے بعد کی چار غزلیں جو صفحات ۷۳۶ و ۸۳۸ کے مابین ہیں محل اشتباہ ہیں۔ اسی طرح ردیف الف کی متعدد غزلیں۔ لیکن ہر تجربہ کار ذوق کا اپنا خاص رنگ ہے۔ یہی رنگ کلام ذوق و غیر ذوق میں تمیز کے واسطے صحیح رہنما کام دیتا ہے۔ کلام پر ذوق کی پوری غزل پڑھ جایئے ایک شعر بھی ایسا نظر نہیں آتا جو ہماری توجہ کھینچے یا ہمارے دل میں تاثیر پیدا کرے۔ کیونکہ اس میں ذوق کی شاعری موجود نہیں ہے۔

حافظ ویران کا اڈیشن میرے نزدیک زیادہ قابل اعتبار ہے۔ ایک تو اس لئے کہ ذوق کی وفات سے آٹھ سال کے بعد طبع ہو چکا تھا دوسرے اس میں کوئی مشتبہ عنصر نظر نہیں آتا۔ اگرچہ اس کے متعلق بھی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں شاہ نصیر وغیرہم کے مطلعے مل گئے ہیں۔ خمخانۂ جاوید سے یہ اطلاع میرے محترم قاضی عبدالودود صاحب

---

[1] ہم نے صرف تین غزلیں نقل کی ہیں۔ (نگار)

بیرسٹر ایٹ لا، پٹنہ نے بہم پہونچائی ہے کہ "متفرق مطلعوں میں کئی مطلع شاہ نصیر اور کئی مطلع معروف و مخیر وغیرہم کے لکھے گئے ہیں۔" (ص ۸۰ جلد دوم، خم خانۂ جاوید۔ از لالہ سری رام)

اس غلطی کا پرتو مولانا کے مرتبہ دیوان ذوق پر بھی پڑنا چاہئے، علاوہ بریں مولانا نے بعض اشعار دیگر شعرا کے اتفاقیہ لے لئے ہیں۔ مثلاً سکندر کی رباعی اور جہاندار کا شعر مولانا نے بقول قاضی صاحب ممدوح الذکر ذوق کے حوالے کر دئے ہیں۔ جہاندار کا شعر ہے:

آخر گل اپنی صرف در میکدہ ہوئی — پہونچے وہاں ہی خاک جہاں کا خمیر ہو

(ص ۸۱، گلشن بیخار از نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، طبع دہلی، اردو اخبار پریس ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۳ء)

مولانا کے ہاں یہی شعر بہ تبدیل ردیف و دیگر فرق یوں آیا ہے:

آخر گل اپنی خاک در میکدہ ہوئی — پہونچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

(دیوان ذوق، مرتبہ آزاد، مطبع رفاہ عام لاہور، ۱۹۲۲ء)

سکندر کی رباعی مصحفی نے اپنے تذکرہ میں یوں درج کی ہے:

اے زاہد و تم سے کیا جھگڑ کر لوں میں — ناحق میں دل اپنے کو کروں کیوں خوں میں

میخوار و صنم پرست کہتے ہو مجھے — ہوں میں ہوں میں جو کچھ کہ ہوں میں ہوں میں

(ص ۱۰، تذکرۂ ہندی از مصحفی۔ طبع انجمن ترقی اردو) ۔ اور قاسم نے یوں دی ہے:۔

اے زاہد و تم سے کیا جھگڑ کر لوں میں — ناحق کو دل اپنا پہ کروں کیوں خوں میں

میخوار و بت پرست کہتے ہو مجھے — ہوں میں ہوں میں جو کچھ کہ ہوں میں ہوں میں

(ص ۳۰۰، جلد اول مجموعۂ نغز از میر قدرت اللہ قاسم، طبع پنجاب یونیورسٹی)

مولانا نے یہی رباعی ذوق کے نام پر دے دی ہے۔ چنانچہ

اے زاہد و تم سے کیا جھگڑ کر لوں میں — غصہ سے کروں کس لئے دل کو خوں میں

میخوار و صنم پرست کہتے ہو مجھے — تم ہو تم ہو جو کچھ کہ ہوں میں ہوں میں

(ص ۲۵۵، دیوان ذوق، مرتبۂ آزاد)

(ہندستانی) — پروفیسر محمود شیرانی (مرحوم)

یہ نہ بھولئے

کہ نگار کا چندہ اب چھ روپیہ سالانہ ہے اور ایک سال سے کم کے لئے جاری نہیں ہو سکتا۔ — منیجر نگار

راشٹریہ سوایم سیوک سنگھ

(تاریخی روشنی میں)

اس تحریک کا بانی ناگپور کا ایک ڈاکٹر (کیشو راؤ بلی رام) تھا اور ۱۹۲۵ء میں اس تحریک کا آغاز ہوا۔ اس تحریک کا مقصد ہندوؤں کے قدیم شاندار ماضی کو دوبارہ زندہ کرنا اور اسی کے پیش نظر ہندوؤں میں ایک خاص قومی کردار پیدا کرنا تھا۔ اس شخص کا ۱۹۴۰ء میں انتقال ہو گیا اور آغاز تحریک کے بعد سے اس کے انتقال تک پندرہ سال کے زمانہ میں ایک محدود حلقہ کے سوا کسی نے اس کو نہ جانا۔

اس کے بعد اس تحریک کی تنظیم "شری مادھو راؤ سدا شیو راؤ گولوالکر" کے ہاتھ میں آئی، یہ بنارس ہندو یونیورسٹی میں سائنس کا لکچرر رہ چکا تھا اور اس تحریک کے حامیوں کے حلقہ میں "پرم پوجا نیا گرو جی" کے لقب سے مشہور ہے۔

اب سے دس سال قبل جب دوسرے صوبوں کے لوگ بھی اس میں شامل ہونے لگے، تو اس تحریک میں کچھ اور جان پڑی۔ (چنانچہ ۱۹۴۱ء میں پنجاب کے سب سے پہلے ممبر سے لاہور میں حلف لیا گیا) لیکن اس کو نمایاں حیثیت ۱۹۴۷ء ہی سے حاصل ہوئی جب اس نے کانگریس کے فلاف یہاں ہندو راج قائم کرنے کی تحریک شروع کی اور مسلم لیگ نے اپنا مطالبہ پاکستان پیش کیا۔ گولوالکر نے ۱۹۳۹ء میں ایک پمفلٹ لکھ کر شائع کیا جس میں اس نے ظاہر کیا تھا کہ۔۔۔ "ہندوؤں کے متعلق یہ کہنا کہ وہ آرین قوم کی اولاد ہیں اور ہندوستان میں وہ تین ہزار سال سے ایک ہزار قبل مسیح تک کے درمیان آئے، صحیح نہیں ہے۔ یہ نظریہ مغربی مورخین نے صرف اس لئے وضع کیا ہے کہ ہندو قوم کو یہاں کے لئے ایک اجنبی قوم قرار دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں کی تاریخ تمدن و تہذیب بہرحال دس ہزار سال پرانی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندو کسی وقت شمال کے منطقۂ بارد سے متعلق تھے لیکن یہ اسوقت کی بات ہے جب قطب شمالی اس حصۂ زمین میں تھا جسے اب بہار و اڑیسہ کہتے ہیں"۔ اس پمفلٹ میں یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ "قوم نام ہے پانچ چیزوں کے امتزاج و اختلاط کا۔ ملک، نسل، مذہب، تہذیب و زبان۔۔۔ اور اس لحاظ سے ہندوؤں کی قومی وحدت ہزاروں سال پرانی ہے۔۔۔ مسلمان اور انگریز حملہ آوروں نے یہاں صرف ۱۰۰ سال حکومت کی ہے اور اتنی قلیل مدت میں کوئی اجنبی جماعت اپنی قومیت جداگانہ قایم نہیں کر سکتی اور اگر وہ یہاں رہنا چاہتی ہے تو صرف انھیں حقوق کے ساتھ جو ہندو اکثریت کی طرف سے انھیں دئے جائیں گے۔

گولوالکر نے کانگرس پر یہ الزامات قایم کئے ہیں کہ " وہ مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے ہندو قومیت میں انتشار پیدا کر رہی ہے - وہ اشتراکیت کے بھی مخالف ہے کیونکہ سوویٹ روس ایک مادی فلسفہ کا تابع ہے - وہ مغربی اصول کی بھی پابند نہیں کیونکہ مغرب قومی تمدن کے بقا کو ضروری سمجھتا ہے اور کانگرس ہندو تہذیب کو فنا کرنا چاہتی ہے "

وہ اپنے پمفلٹ میں ذات پات کے قیام کو ضروری قرار دیتے ہوئے ظاہر کرتا ہے کہ " ہندو قوم اپنی قدیم شان و شوکت صرف اس لئے حاصل نہیں کر سکی کہ اس میں صحیح قومی احساس پیدا نہیں ہوا - ذات پات کی تفریق کو اس کا سبب قرار دینا غلط ہے " اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ " مسلمانوں کی قوم کو ایک علیحدہ قوم قرار نہ دینا اور اس کو بھی اپنی ہی قوم میں شامل کرنا ہندو قوم کے لئے سخت خطرہ کی بات ہے "

گولوالکر ایک پستہ قد سیاہ رنگ انسان ہے - جس کی گھنی ہوئی داڑھی اور بڑھے ہوئے بال نے اس کی ہیئت کو اور زیادہ غیر دلکش بنا دیا ہے - وہ کوئی اچھا مقرر بھی نہیں ہے، لیکن تنظیم کی صلاحیت جو لیڈر شپ کے لئے ضروری شرط ہے، اس میں بڑی زبردست ہے -

اس میں شک نہیں کہ ملک کی سیاسی حالت نے اس تحریک کو زیادہ قوی بنایا اور بعض دولت مند لوگوں نے مالی امداد کر کے اس کی بنیاد مستحکم کرنے میں بڑی اعانت کی، لیکن اس کی کامیابی و وسعت منحصر ہے زیادہ تر تنظیم کی خوبی پر -

اس تحریک کے لیڈروں نے ہندوستان اور یوروپ کی مختلف سیاسی تحریکوں کا مطالعہ کر کے اپنی جماعت کی تنظیم کے لئے بعض ایسے فاشستی اصول متعین کئے ہیں، جو یہاں کی ذہنیت کے لحاظ سے بہت موزوں ہیں -

اس جماعت کی تنظیم شروع ہوتی ہے نیچے سے اور پھر وہ تدریج کے ساتھ اونچی ہوتی جاتی ہے - سب سے پہلی بنیادی شاخ ۵۰ ممبروں پر مشتمل ہوتی ہے جس کا لیڈر " چیف ایک " کہلاتا ہے - اس کے اوپر کی جماعت وہ ہے جس میں کئی بنیادی شاخیں شامل ہوتی ہیں اور اس کے لیڈر کو " شکشک " کہتے ہیں - اس کے اوپر کا لیڈر " بھاگ ادھیکاری " کہلاتا ہے اور وہ شخص جو کئی بھاگوں کا سردار ہوتا ہے، اسے " بھاگ ادھیکاری " کہتے ہیں - اس کے بعد متعدد بھاگ ادھیکاریوں کی تنظیم صوبہ کی تنظیم سے متعلق ہو جاتی ہے جسے " پرانتا چالک " کہتے ہیں اور پھر اس صوبائی تنظیم کے اوپر ایک مرکزی تنظیم ہے جسے " سرسنگھ چالک " کہتے ہیں اور یہ عہدہ ہے گولوالکر (گروجی) کی ذات ہے -

راشٹریا سیوک سنگھ صوبوں کی موجودہ تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ وہ اس تقسیم پر آتا ہے، جو قدیم ہند میں پائی جاتی تھی مثلاً صوبہ دہلی میں مشرقی پنجاب اور مغربی یوپی کے کچھ اضلاع بھی کانپور تک شامل کرنا چاہتا ہے - اس سے بھی دوسرا صوبہ وہ کاشی کا بنانا چاہتا ہے جو لکھنؤ سے بنارس تک پھیلا ہوا ہوگا -

اس جماعت کے افراد ایک مخصوص مکان میں جو ایک یا دو کمرے کا ہوتا ہے اور صحن بھی رکھتا ہے اپنا اکھاڑا قایم کرتے ہیں اور صحن کے درمیان زعفرانی رنگ کا جھنڈا نصب ہوتا ہے، ہر ممبر روزانہ آدھ گھنٹہ کے لئے یہاں حاضر ہوتا ہے جہاں

جسمانی ورزش کے بعد سنسکرت زبان میں پرارتھنا کی جاتی ہے اور جھنڈے کو سلامی دیجاتی ہے، اس کے بعد ہر ممبر کو کچھ احکام دئے جاتے ہیں - ان کا جھنڈا ان کے گرو کی علامت ہے لیکن اس کا احترام وہ گرو سے زیادہ کرتے ہیں۔ کیونکہ انکے نزدیک ہر انسان غیر مکمل ہے یہاں تک کہ گرو بھی، لیکن جھنڈا اپنی جگہ بڑی مکمل چیز ہے اور اس بلند نصب العین کی نشانی ہے جس تک پہونچنا ہر ممبر کا فرض ہے۔

سلامی کے دو طریقے ان کے یہاں رائج ہیں۔ ایک پوری سلامی اور دوسری نصف، جھنڈے کو پوری سلامی دیجاتی ہے اور وہ اس طرح کہ داہنا ہاتھ کھلا ہوا سب سے نیچے کی پسلی کے پاس زاویہ قائمہ بناتا ہوا رکھا جاتا ہے اور سر کو جھکا دیا جاتا ہے، نصف سلامی میں ہاتھ کی جگہ تو وہی رہتی ہے لیکن سر نہیں جھکایا جاتا۔ جھنڈے کے سوا تمام لیڈروں یہاں تک کہ گرو کو بھی نصف سلامی دیجاتی ہے۔

ہر ممبر کا فرض ہے کہ وہ سنگھ میں باوردی آئے۔ وردی میں سفید قمیص، کھلا ہوا کالر، ہلکے نیلے رنگ کے موزے خاکی نیکر، پیٹی، کرمچ کا جوتا اور سیاہ ٹوپی شامل ہے اور یہ وردی بہت معمولی قیمت پر سنگھ کی طرف سے فراہم کی جاتی ہے سیاہ ٹوپی ماتمی علامت ہے اور اس کا استعمال اسی وقت ترک ہوگا جب ہندوستان میں صحیح ہندو راج پھر قایم ہو جائے گا۔

سنگھ کے ممبروں کے لئے نباتاتی ہونا ضروری نہیں، وہ گوشت کھا سکتے ہیں، لیکن تمباکو اور شراب کا استعمال بالکل ممنوع ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں جسمانی صحت کے قیام کے منافی ہیں۔

ہر ممبر کا فرض ہے کہ وہ سنگھ کے اصول کی اپنے حلقۂ احباب میں اشاعت کرے اور سنگھ کے ممبر بنائے۔ جب کوئی شخص ممبر بننا چاہتا ہے تو وہ سنگھٹن کی جگہ حاضر ہوتا ہے اور مذہب، دھن اور جھنڈے کی وفاداری کا حلف اس سے لیا جاتا ہے۔ سکھوں کے لئے سنگھ کی شرکت ممنوع نہیں ہے، کیونکہ وہ سکھوں کو بھی ہندو جاتی میں شریک سمجھتے ہیں اور گرو گوبند سنگھ کا بڑا احترام کرتے ہیں کیونکہ انھوں نے مسلم فرمانرواؤں سے جنگ کی تھی لیکن عورتیں اور اچھوت تو ہیں سنگھ میں شریک نہیں ہو سکتیں۔

یہ تحریک نوجوانوں کے جذبات کو زیادہ اپیل کرتی ہے اور اسی لئے اس جماعت میں نوجوان بکثرت شامل ہیں۔ اس کے ممبروں کی ایک بڑی تعداد متوسط طبقہ کے لوگوں، کلرکوں، چھوٹے چھوٹے دوکانداروں اور کاریگروں پر مشتمل ہے۔

پچھلے چند سال کے اندر سرکاری ملازموں کی بھی ہمدردی اسے حاصل ہو گئی ہے اور نہ صرف کلرک بلکہ بعض بڑے بڑے افسر بھی اس میں شریک ہو گئے ہیں۔ بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو اسکی پابندیوں سے گھبرا کر اس سے علیحدہ ہو گئے ہیں، لیکن ان کی ہمدردیاں بدستور سنگھ کو حاصل ہیں۔

سنگھ کے راز ہر ممبر کو نہیں بتائے جاتے اور تمام احکام زبانی دئے جاتے ہیں، بلکہ نہایت آہستہ سے کان میں کہدئے جاتے ہیں - جب یہ احکام کسی اور مقام تک پہونچانا ہوتے ہیں تو خاص آدمیوں اور پیام رسانوں کے ذریعہ سے پہونچائے جاتے ہیں اور ذریعہ ڈاک کبھی نہیں بھیجے جاتے۔

ان کا جمگھٹ نیم فوجی انداز کا ہوتا ہے اور تمام کارروائی ہندی میں ہوتی ہے جس کو وہ راشٹریا بھاشا (قومی زبان) کہتے ہیں اس کی تمام کارروائیاں خفیہ ہوتی ہیں اور ان کا اعلان و اشتہار پسند نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ ان کے لیڈروں کی تصویریں، تقریریں اور جلسہ کی کارروائیاں بھی شایع نہیں کی جاتیں ـــ صحت جسمانی اور قوت اخلاق پر ان کے یہاں بڑا زور دیا جاتا ہے۔ ورزش فوجی قواعد روزانہ لازم ہے اور تعطیلوں میں دریا کے کنارے یا کسی بڑے میدان میں ان کا اجتماع بڑے پیمانہ پر ہوتا ہے۔ نفسیاتی طور پر بھی ممبروں کی ذہنیت بدلنے کی کوشش کی جاتی ہے، مثلاً کانگرس کے خلاف نفرت و عناد کا جذبہ قوی کرنے کے لئے جلسوں میں کانگرس کے بڑے لیڈر مثلاً نہرو اور گاندھی جی وغیرہ کو گالیاں تک دیجاتی ہیں، جوتوں کے اندر ان کی تصویر رکھدی جاتی ہے اور اس طرح جذبۂ نفرت شدید بنایا جاتا ہے ـــ ان کے بڑے بڑے جلسے کیمپوں میں ہوتے ہیں اور نہایت وسیع پیمانہ پر۔ چنانچہ مارچ اور دسمبر ۱۹۴۷ء میں ان کے جلسے جو دہلی میں ہوئے تھے ان میں علاوہ ۲۰ ہزار رضاکاروں کے ۵۰ ہزار ممبر شریک تھے۔ ایک بہت بڑے میدان میں بھانت بھانت کی پرانتیا چلک بیس فیٹ اونچے چبوترے پر کھڑے ہوئے ہدایات دیتے تھے اور والنٹیر نہایت نظم و سلیقہ کے ساتھ ان کی تعمیل کرتے تھے۔

سرسنگھ چالک کو ٹھیک ساڑھے تین بجے آنا تھا۔ سوا تین بجے ۲۰ ہزار والنٹیروں نے ہم آواز ہو کر پرارتھنا کی بھجن گائی اور اس کے بعد مکمل خاموشی چھا گئی۔ ٹھیک ساڑھے تین بجے گروجی ایک کھلی ہوئی موٹر کار سے اترے اور لاؤڈ اسپیکروں سے صدا گونجی کہ گروجی آگئے ہیں۔ نگاہ سامنے رکھو۔ گروجی اتر کر درمیانی چبوترہ پر گئے، جھنڈے کو سلامی دی اور کارروائی شروع ہوگئی۔

سنگھ کے ممبروں کی تعداد کا اندازہ پانچ سے پچاس لاکھ تک کیا جاتا ہے، لیکن صحت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا جاتا۔ تاہم گروجی کے اس فقرے سے کہ "اگر میں سنگھ کی تمام شاخوں کا معائنہ کرنے جاؤں تو بیس پچیس سال سے کم میں اس کام کو انجام نہیں دے سکتا" اس کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ممبری کی کوئی فیس مقرر نہیں ہے لیکن ہر ممبر سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ سالانہ کچھ نہ کچھ رقم سنگھ کے فنڈ میں داخل کرے۔ اسے وہ دکشنا (خیرات) کہتے ہیں۔ معمولاً کانگ کے زمانہ میں (۱۵ نومبر سے ۱۵ دسمبر تک) یہ دکشنا دیا جاتا ہے اور اسکی صورت یہ ہوتی ہے کہ دکشنا دینے والا تنہا آتا ہے اور جھنڈے کے نیچے پیتل کی تھالی میں کچھ رقم رکھ کر اپنی شاخ کے لیڈر کو دیجاتا ہے۔ اس رقم کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا جاتا اور نہ وہ بنک میں جمع کی جاتی ہے ـــ ہر ممبر اپنے ہی مقامی سنگھٹن کے ممبروں سے واقف ہوتا ہے، نہ وہ دوسرے سنگھٹنوں کے ممبروں سے واقف ہوتا ہے اور نہ اس بات سے کہ کہاں کیا کارروائی ہو رہی ہے۔ یہ راز صرف بھاگ ادھیکاریوں اور صوبہ کے لیڈروں کو معلوم ہوتے ہیں۔ خطرہ اور ضرورت کے وقت اسکے اکثر ممبر اور بڑے چھوٹے لیڈر چھپ جاتے ہیں اور صرف خاص خاص مشہور لیڈر گرفتار ہو جاتے ہیں جس سے سنگھ کی تنظیم کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا ـــ یہ اپنے آپ کو صرف مدافعت کرنے والی جماعت کہتے ہیں، لیکن مشرقی پنجاب اور دہلی وغیرہ میں جو خونریزی ہوئی ہے، اس میں انھوں نے منظم طور پر حصہ لیا اور گاندھی جی کے قتل کے سلسلہ میں جو حالات اسوقت تک معلوم ہوئے ہیں، وہ بھی ایک حد تک اس جماعت کے جارحانہ اقدامات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

انشاء ایک نثار اور ماہر لسانیات کی حیثیت سے

اُردو نثر میں انشا کی صرف ایک کتاب "رانی کیتکی و کنور اودے بھان کی کہانی" ملتی ہے۔ اس میں مصنف نے یہ التزام کیا ہے کہ کوئی عربی یا فارسی یا سنسکرت کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ ٹھیٹ ہندوستانی زبان میں تمام و کمال قصہ قلم بند کیا جائے۔ مصنف کو اس کوشش میں خاطر خواہ کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ اسی لئے موجودہ زمانہ میں اس کتاب کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جبکہ ہندوستان کے چند مشہور زعما اُردو اور ہندی کو ملا کر ایک نئی زبان "ہندوستانی" ایجاد کرنا چاہتے ہیں۔ اس کہانی کی تصنیف کا سبب خود مصنف نے شروع کتاب میں یہ لکھا ہے:۔ "ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان میں چڑھ آئی کہ کوئی کہانی ایسی کہئے جس میں ہندوی چھٹ اور کسی بول سے پٹ (سوا) نہ ملے۔ جیسے بیچ میرا جی پھول کی کلی کے روپ سے کھلے۔ باہر کی بولی اور گنواری کچھ اُس کے بیچ نہ ہو۔ اپنے ملنے والوں میں سے ایک کو نی بڑے پڑھے لکھے پرانے دھرانے بوڑھے گھاگ یہ کھڑاگ لائے۔ سر ہلا کر منھ بنا کر ناک بھوں چڑھا کر آنکھیں پھیر کر کہنے لگے یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ ہندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکا پن دکھرس جائے۔ جیسے پہلے لوگ اچھے اچھے آپس میں بولتے چالتے ہیں بول کا تول یہی ڈول رہے اور چھانہ کسی کی نہ پڑے۔ یہ نہیں ہونے کا۔ میں نے اُن کی ٹھنڈی سانس کی پروا نہ کی ٹھوکا کھا کر جھنجلا کر کہا۔ میں کچھ ایسا انوکھا (نیا) بولا نہیں جو رانی کو پریت کی دعا دوں اور جھوٹ سچ بول کے انگلیاں نچاؤں اور بے سُری بے ٹھکانے کی اُلجھی سلجھی باتیں سمجھاؤں جو مجھے نہ ہوسکتا تو جھلا یہ بات منھ سے کیوں نکالتا؟ بس ڈھب ہوتا اس بکھیڑے کو ٹالتا۔"

چنانچہ واقعہ ہے کہ سید انشاء نے یہ جو دعویٰ کیا ہے وہ حرف بحرف پورا کر دکھایا ہے۔ پوری کہانی شروع سے لیکر آخر تک پڑھ جایئے کہیں ایک لفظ فارسی یا عربی کا نظر نہیں پڑے گا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اس کتاب کے "پیش لفظ" میں کیا ہی درست لکھا ہے کہ: "عربی فارسی کا ایک لفظ تک نہیں آیا اور پھر لطف یہ ہے کہ بجز سنسکرت کے ہندی نہیں کہ نہ لکھنے والا سمجھے نہ پڑھنے والا۔ (اسے) اُردو والا بھی سمجھتا ہے اور ہندی والا بھی۔ زبان اور بیان دونوں صاف ہیں اسی کا نام ہندستانی ہے۔"

دراصل انشاء کی یہ تصنیف زبان و بیان کے اعتبار سے ایک کارنامہ ہے جو انھیں جیسے شخص کے بس کی بات تھی ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ ترقی کے دور میں، باوجود کوشش کے کوئی ایسی زبان اب تک ایجاد نہیں ہوسکی ہے جو ہندی والوں

اور اُردو والوں دونوں کے لئے قابل قبول ہوسکے۔ آج کل کے بڑے بڑے ماہر لسانیات ہندی اور اُردو کا وہ نقطۂ اعتدال دریافت کرنے میں ناکام رہے ہیں جو انشاؔ نے آج سے سوا سو سال قبل دریافت کرلیا تھا اور اس پر قدرت حاصل کرلی تھی۔ دراصل انشاؔ کا یہ عجیب و غریب اور قابل قدر کارنامہ ہے۔ کہانی مذکورہ کی ایک مختصر عبارت بطور نمونہ نقل کی جاتی ہے۔

"ایک دن رانی کیتکی نے اپنی ماں کام لتا سے بھلاوے میں ڈال کے یہ پوچھا گرو جی گسائیں مہندر گرو نے جو بھبوت باپ کو دیا تھا وہ کہاں رکھا ہوا ہے اور اُس سے کیا ہوتا ہے۔ اُس کی ماں نے کہا میں تیری واری تو کیوں پوچھتی ہے۔ رانی کیتکی کہنے لگی آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے چاہتی ہوں۔ جب اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلوں اور چور بنوں تو کوئی مجھکو پکڑ نہ سکے۔ رانی کام لتا نے کہا وہ کھیلنے کے لئے نہیں ہے۔"

لسانیات

"دریائے لطافت" سید انشاء اللہ خاں انشاؔ اور مرزا محمد احسن قتیلؔ فرید آبادی کی مشترکہ تصنیف ہے۔ پہلا حصہ اُردو صرف و نحو سے متعلق ہے اور دوسرے حصہ میں علم معانی و بیان وغیرہ کا ذکر ہے۔ یہ دوسرا حصہ چونکہ مرزا قتیلؔ کی تالیف ہے اس لئے ہمارے لئے خارج از بحث ہے۔

انشاؔ نے اپنی کتاب کو سات ابواب پر تقسیم کیا ہے اور ہر باب مختلف فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں انھوں نے اُردو کے حروف ابجد سے بحث کی ہے اور اُن کی تعداد کا تعین اپنے ایک خاص نظریہ کے تحت کیا ہے۔ اُنھوں نے عام قاعدہ کے مطابق صرف یہی کہدینے پر اکتفا نہیں کی ہے کہ عربی، فارسی، ہندی وغیرہ کے اتنے اتنے حروف اُردو میں مستعمل ہیں، بلکہ ایسا کرنے کے بعد اُن حروف کا تعین کیا ہے جو دوسرے حروف سے ملکر ایک خاص اور علٰحدہ آواز پیدا کرتے ہیں مثلاً انھوں نے سترہ حروف ایسے گنائے ہیں جو 'ہ' کے ساتھ ملکر اپنی ایک علٰحدہ آواز رکھتے ہیں، جیسے بھاگنا، پھٹنا وغیرہ الفاظ میں۔ اور سترہ حروف ایسے بتائے ہیں جن کی آواز نون کی آواز سے مرکب ہوکر ایک نئی آواز پیدا کرتی ہے مثلاً رنگیلا، ھنسنا وغیرہ الفاظ میں۔

اسی طرح انھوں نے بعض ایسے حروف کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو 'ی' سے ملکر ایک الگ چیز بن جاتے ہیں مثلاً پیارا، دھیان وغیرہ الفاظ میں۔

اس طرح انشاؔ نے اُردو کے حروف تہجی کی کل تعداد پچاسی مقرر کی ہے۔

اس کتاب کا دوسرا باب بہت دلچسپ ہے۔ اس میں دہلی کے تمام محلوں کی مروجہ زبان اور اُن کے آپس کے اختلاف کا ذکر ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کن محلوں کی زبان فصیح اور کن کی غیر فصیح ہے۔ اس کے علاوہ مختلف فرقوں مثلاً پنجابیوں، کشمیریوں، پوربیوں، ہندوؤں، سیدوں اور مختلف پیشہ وروں کی زبان اور اُن کے مختلف لب و لہجہ و تلفظ کا ذکر بھی بڑی تفصیل کے ساتھ معہ مثالوں کے کیا ہے۔ جو دلچسپ ہونے کے علاوہ تاریخی قدر و قیمت بھی رکھتا ہے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

اعلیٰ طبقہ کی زبان انشاؔ: "ابتدائے سن صبا (لڑکپن) تا اوائل ریعان (نوجوانی) اور اوائل ریعان سے الی الآن (اب تک) اشتیاق مالایطاق تقبیل عتبۂ عالیہ نہ بہ حدے تھا کہ سلک تحریر و تقریر میں منظم ہو سکے۔ لہذا بے واسطہ و وسیلہ حاضر ہوا ہوں۔"

سید انشاؔ کا مرزا مظہر جانجاں سے مکالمہ

مرزا مظہر کا جواب:۔ "اپنے تئیں بھی (ہم کو بھی) بد و طفلی سے تمھیں سے اشخاص کے ساتھ موانست و محالست رہا کی ہے۔"

سادات بارہہ کے محلے کی زبان ۔ "اس چھورے کوں (کو) میں نے کنہلاں (کہنا) کہا کہ مجھ سوں (سے) نہ بولا کر دونوں ٹانگاں (ہاں) (میں) سر کر دوں گا۔"

ایک ہندو دلال کی زبان ۔ "شخی (سخی) بھی ایسا کہ ایسا کوئی بھی نہ ہوگا۔ مجھے دیکھتے ہی باگ باگ (باغ باغ) ہو گیا ہور (اور) دسی گھڑی چھ پیسے آدمی کو دئے کہ چنیال کے واسطے پوریاں ہور (اور) موہن بھوگ تو جا کر لاؤ۔ اور اُس کے آوتے آوتے دھیلے کی گاجراں ہور دھیلے کا چنا گڑ لیکے دیا کہ جب تک وہ اوتارے اُسکے آوتے توڑی منہ تو جھٹا لو۔"

اس باب کی چوتھی فصل سب سے زیادہ کار آمد و دلچسپ ہے اس میں چند فصیحوں کا ذکر ہے اور بعض ایسے الفاظ کا بیان ہے جو میر و مرزا کے زمانہ میں مستعمل تھے لیکن بعد میں ترک کر دئے گئے۔ یہاں بھی مثالوں کے ذریعہ مطالب کی تشریح کی گئی ہے، چنانچہ نواب عماد الملک و بھاڑامل اور صدر الدین صفا ہائی و ملا عبد الفرقان وغیرہ کے مکالموں کے علاوہ مختلف طبقات کی عورتوں مثلاً بیگموں، باندیوں، کسبیوں وغیرہ کی بولیوں کے نمونے بھی دئے گئے ہیں۔ نواب عماد الملک کا بھاڑامل سے سوال اور اُس کا جواب ملاحظہ فرمائیے:

عماد الملک ۔ "اجی لالہ بھاڑامل تمھارے احوال پر باللہ کو ہم سخت متاسف ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ بڑا تعجب ہے کہ آدمی باوصف تمیز نعمائے الٰہی سے محروم رہے اور نام اُس کا رحم اور شفقت رکھے۔۔۔۔۔۔۔ اگر تم بازار سے لیکر کھاؤ تو کیا مانع ہے۔"

بھاڑامل ۔ "پیر و مرشد مہارے (ہمارے) دھرما (میں) جیو کا مارن بڑا دوکھ ہے۔ ہور (اور) کھاؤنا تو ہور بھی برا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

براتی بیگم اور مولوی کرم الرحمٰن کی کنیز کا مکالمہ بھی سنئے:۔

براتی بیگم ۔ "اری سر مونڈی باندی تو اتنا جھوٹھ کیوں بولتی ہے اللہ کرے تیری بوٹی بوٹی اوپر والیاں لے جائیں۔۔۔۔ دُر سے تیرے دیدے سے بیٹھے بٹھائے کیا شغلا اُٹھایا ہے۔ جُس میں چنگاری ڈال جا لو دور کھڑی۔"

باندی ۔ "بیڈم (بیگم) صاحب ٹھڈائے (خدا) جانت ہے جو میں جھٹ (کچھ) بھی ٹہے (کہے) ہوں۔۔۔۔۔"

بی نورن بی اور میر غفر غبنی کا مکالمہ بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں:۔

نورن ۔ "اجی آؤ میر صاحب تم تو عید کے چاند ہو گئے۔ دلی میں آتے تھے دو دو پہر رات تک بیٹھتے تھے اور ریختے پڑھتے

تھے۔ لکھنؤ میں تمھیں کیا ہوگیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

(میر غفر غینی کے جواب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اُن کی گویائی میں ایک خرابی تھی وہ یہ کہ بات کرنے کے وقت لام اور رے کبھی 'غ' ہوکر اور کبھی 'ی' ہوکر اُن کے منھ سے نکلتے تھے)

میر موصوف ۔" اجی بی نوغن یہ بات کیا فخماتی ہو تم تو اپنے جیوغے کی چین ہو پغ کیا کہیں جب سے دغی چھوٹی ہے کچھ جی افسغدہ ہوگیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس باب کا آخری حصہ بہت زیادہ اہم ہے جس میں انشاء نے دہلی و لکھنؤ کی فصاحت کا موازنہ و مقابلہ کیا ہے اور دونوں مقامات کی برتری کے دعوے داروں کی دلیلیں پیش کرنے کے بعد اپنی ذاتی رائے کا اظہار کیا ہے۔

تیسرے باب کی پہلی فصل دہلی کے روزمرہ اور محاورات کے علاوہ دہلی کے مختلف بازاروں اور محلوں کے ناموں کے بیان کے ساتھ ساتھ لفظ "شہدہ" کی تحقیق اور شہدوں کی زبان کے نمونوں پر مشتمل ہے۔ ایک شہدہ کی گفتگو ملاحظہ فرمایئے: "ابے دیخ (دیکھ) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھ کو بھی نواب صاحب جانتے ہیں کل جما بھٹیارے کی دوکان پر مجھے دیخ (دیکھ) کر ہنس دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس باب کی دوسری فصل زنانہ محاوروں اور رنگیں و رنگینی کے حالات پر مشتمل ہے۔

باب چہارم میں صرف کا بیان ہے جس میں فعل کی قسمیں اور صیغے۔ اُردو میں مصدر سے ماضی بنانے کے قاعدوں سے علاوہ پنجابی۔ برج بھاشا پوربی وغیرہ زبانوں کی علامات مصدر کو بھی بتایا اور سمجھایا گیا ہے۔

باب پنجم نحو کے بیان میں ہے اور یہی اس کتاب میں سب سے زیادہ طویل باب ہے کیونکہ اس میں پچیس فصلیں ہیں ابواب چہارم و پنجم کی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ مولوی عبدالحق کے ان الفاظ سے ہوتا ہے:

"یہ اول کتاب ہے جس میں اُردو کی صرف و نحو بلحاظ زبان بیان کی گئی ہے اور عربی فارسی کی اندھوں کی طرح تقلید نہیں کی گئی"

"سید انشاء نے دوسرے صرفیوں اور نحویوں کی طرح (حالانکہ وہ بعد میں ہوئے) آنکھوں میں پٹی باندھکر عربی فارسی کی تقلید نہیں کی بلکہ انھوں نے زبان کی فطرت اور ساخت سمجھ کر اس کے اصول قایم کئے ہیں۔ ان کی حیثیت مقلد کی نہیں بلکہ مجتہد کی ہے"۔

باب ششم فعل کے بیان میں ہے اور باب ہفتم میں چند مفید اور اصولی نکتے بیان کئے گئے ہیں جن کی تعریف اور توصیف مولوی عبدالحق صاحب نے ان الفاظ میں کی ہے:

"وہ (انشاء) کہتے ہیں کہ ۔ ۔ ہر لفظ جو اُردو میں مشہور ہوگیا عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی از روئے اصل غلط ہو یا صحیح وہ لفظ اُردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر

خلاف اصل مستعمل ہے تو بھی صحیح ہے۔ اُس کی صحت و غلطی اُردو کے استعمال پر موقوف ہے۔ کیونکہ جو کچھ خلاف اُردو ہے غلط ہے گو اصل میں وہ صحیح ہو اور جو کچھ موافق اُردو ہے صحیح ہے گو اصل میں صحت نہ رکھتا ہو ـــــ اس اُصول کو قایم کرنے کے بعد وہ بہت سے عربی الفاظ کو جو اُردو میں کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں صحیح بتاتے ہیں مثلاً سید انشاء کی رائے میں "بُرقا" صحیح اُردو کا لفظ ہے گو وہ خلاف اصل ہے۔ یا وہ 'عذر' کو بفتح دال اُردو کا صحیح لفظ خیال کرتے ہیں اگرچہ اصل میں بسکون دال ہے۔"

اس کتاب کی اہمیت کے متعلق پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی لکھتے ہیں:۔ "دریائے لطافت کئی وجوہ سے خاص امتیاز اور فضیلت رکھتی ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جو اُردو کے علم لسان گریمر انشا اور محاورے اور روزمرہ پر کسی ہندی نے تصنیف کی" آگے چل کر لکھتے ہیں:

"آج ادب اور زبان سے متعلق جو کوئی بھی جو کچھ لکھتا ہے اس کے سامنے یورپ کا لٹریچر اور اس کے ادیبوں کے نظریے ہوتے ہیں۔ دریائے لطافت کا سنہ تصنیف اُنیسویں صدی عیسوی کا آٹھواں برس ہے اُس زمانہ میں اور یورپ کی زبانوں اور علم و ادب سے ناواقف محض ہونے کے باوجود سید انشاء کا یہ کتاب تصنیف کرنا اس کی یہ پرواز رکھنا ان کی دقت نظر اور سائنٹفک تنقید اس روشنی کے زمانہ میں محیر العقول ہے۔"

مولوی عبدالحق اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: "عجیب جامع اور بے مثل کتاب ہے۔ اُردو زبان کے قواعد، محاورات اور روزمرہ کے متعلق اس سے پہلے کوئی ایسی مستند اور محققانہ کتاب نہیں لکھی گئی۔ جو لوگ اُردو زبان کا محققانہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں یا اس کی صرف و نحو یا لغت پر کوئی محققانہ تالیف کرنا چاہتے ہیں اُن کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں ـــ "یہ کتاب انھوں (انشاء) نے ایسی لکھی ہے کہ جب تک اُردو زندہ ہے اس کے مطالعہ اور اس سے استفادہ اور سند لینے کی ضرورت باقی رہے گی" (مقدمہ دریائے لطافت)

رحمت نبی خاں ایم۔ اے (علیگ)

مالہ و ماعلیہ

حضرت نیاز کے ان تمام مقالات کا مجموعہ جن میں عصر حاضر کے اکابر شعراء کے کلام پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ زیر طبع ہے۔ قیمت علاوہ محصول دو روپیہ ـــ مینجر نگار

ترکی، امریکہ کی سامراجی گرفت میں

تقریباً ایک سال کا عرصہ ہوا کہ صدر ٹرومین نے امریکی کانگرس کو پیغام دیا تھا کہ ترکی کی موجودہ رجعت پسند حکومت کو فوری "امداد" دیجائے اور اب اس پیغام کے نتائج صاف طور پر ظاہر ہو چلے ہیں۔

ترکی کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ نہیں ہے کہ سامراجی حکومتوں نے اسے مالی، معاشی اور دیگر اقسام کی "امداد" بہم پہونچانے کا بہانہ کرکے اپنا کام نہ نکالا ہو، ترکی معاشی اعتبار سے کمزور اور پچھڑا ہوا ملک ہے اور مدتوں سے یورپی ممالک کے توسیعی منصوبوں کا شکار بنا ہوا ہے۔ انھوں نے اسے مالی، معاشی اور ٹیکنکل امداد بہم پہونچا کر یہاں اپنا کنٹرول قایم رکھا ہے اور اسے اپنا نو آبادیاتی محکوم ملک تصور کرتے ہیں۔ لینن نے اپنی مشہور تصنیف "سامراجیت" میں ترکی کو نیم غلام ملک کہا ہے کیونکہ ظاہرا وہ تو سیاسی طور پر آزاد ہے، لیکن سیاسی حکمت عملی اور مالی اعتبار سے دراصل محکومیت کے بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے۔

ترکی ایک عرصہ تک دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کے زیر اقتدار شکست خوردہ ملک رہچکا تھا۔ ترکی کی عدالتیں بیرونی ممالک کے لوگوں پر مقدمہ نہیں چلا سکتی تھیں اور اپنی مرضی سے بیرونی ممالک کے مال پر محصول لگانے کا بھی اسے کوئی اختیار نہ تھا۔ ترکی میں بیرونی ممالک کی کمپنیوں اور ڈاک کی سروس وغیرہ کو خاص مراعات حاصل تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی کی صنعت کو بڑا نقصان پہونچا۔

پہلے ترکی کی مالی اور معاشی "امداد" ہمیشہ فوجی قسم کی ہوتی تھی تاکہ سامراجیوں کے غارتگرانہ مقاصد پورے ہوتے رہیں اور عثمانی سلطنت بڑی بڑی جنگی مہموں میں مصروف رہے، ترکی کے ان دوست نما دشمنوں میں برطانیہ اور فرانس خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں جنھوں نے اپنے اصلی مقاصد کے حصول کے لئے خلافت عثمانیہ کی حیات و بقا پر ہمیشہ زور دیا کیونکہ اس طرح وہ سلطنت عثمانیہ کی کمزوریوں سے پورا فایدہ اُٹھا سکتے تھے۔ صورت یہ تھی کہ ترکی کو خاص شرائط پر قرض ملتا تھا اور اس "امداد" کے صلہ میں اسے سامراجیوں کو کچھ نہ کچھ مزید مراعات دینی پڑتی تھیں اور ملک کی مالی اور معیشی حالت رفتہ رفتہ اتنی خراب ہوگئی کہ وہ بیرونی ممالک کے قرضوں کا سود بھی ادا نہ کرسکا اور اپنے دیوالیہ ہونے کا اعلان کردیا۔ اس پر ترکی کی دوست حکومتوں نے اس کے تمام ذرایع آمدنی اپنے کنٹرول میں لے لئے اور ۱۸۸۱ء میں

"سلطنت عثمانیہ کے قرضوں کی انتظامیہ کمیٹی" قایم ہوئی جو پوری طرح ملک کی حکمراں بن گئی۔ اس میں شک نہیں ترکی نے بعد کو اس نیم غلامی سے نجات حاصل کی اور سوشلسٹ انقلاب عظیم سے متاثر ہو کر وہاں کی قومی آزادی کی تحریک کامیاب ہوئی لیکن اب ترکی پھر رجعت پسندی کی طرف لوٹ رہا ہے اور پھر بیرونی ممالک کی کمپنیوں کو مراعات دی جا رہی ہیں، جنھیں زبردست جدوجہد اور قربانیوں کے بعد ختم کیا گیا تھا۔

ترکی کو امداد دینے کے متعلق حال ہی میں امریکہ کے محکمہ خارجہ نے ایک کتابچہ شایع کیا ہے اور اس میں ترکی کے اندر امریکی توسیعی منصوبوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ کہتے تو یہ ہیں کہ یہ سب کچھ ترکی کی آزادی کی حفاظت کے لئے کیا جا رہا ہے، لیکن جو مقصود ہے وہ ظاہر ہے — ترکی کی فوج کو جدید طرز پر منظم کرنے کے لئے امریکی کانگرس نے دس کرور ڈالر منظور کئے ہیں لیکن یہ سب کے سب فوجی ضروریات پر صرف کئے جائیں گے۔ یعنی ان سے ہوائی جہاز، ٹینک، توپیں، ٹرک، رسل و رسایل کا سامان، سڑکیں تعمیر کرنے کا سامان خریدا جائے گا اور اس منظور شدہ قرضہ کی تقسیم یوں ہوگی: چار کرور ۸۵ لاکھ ڈالر بری فوج کے لئے، ایک کرور ۴۷ لاکھ ۵۰ ہزار ڈالر بحری فوج کے لئے، ۲ کرور ۶۷ لاکھ ۵۰ ہزار فضائی فوج کے لئے، ۵۰ لاکھ ڈالر اسلحہ خانہ کی از سر نو تعمیر کے لئے، اور ۵۰ لاکھ ڈالر سڑکوں اور شاہراہوں کی تعمیر کے لئے۔

صدر ٹرومین نے ۱۶ فروری کو کانگرس کے سامنے اپنی سہ ماہی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ امریکہ ترکی کے معاملات میں مداخلت کی پالیسی جاری رکھنا چاہتا ہے کہ ترکی کو ۱۲ کرور ۵ لاکھ کا مزید قرضہ منظور کرنے پر زور دیا ہے۔

ترکی میں عسکری تنظیم کے لئے امریکی "امداد" کا پروگرام اتنا وسیع ہے کہ دس کرور ڈالر کے قرضہ کے علاوہ ترکی کو اپنے سرکاری بجٹ کی بہت بڑی رقم بھی اسی پر صرف کرنی ہوگی، چنانچہ ۱۹۵۱ء کے لئے وزارت جنگ کے اخراجات کا تخمینہ کل بجٹ کا ½ حصہ ہے۔ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۷ء کے دوران میں ترکی نے دس لاکھ فوج رکھنے کے لئے ۳۰ ارب لیرا (ترکی سکہ) خرچ کئے اور اس کا بوجھ ترکی عوام کو اٹھانا پڑا۔ ترکی معاشی اعتبار سے کمزور اور ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ اب امریکی زیر اقتدار وہ بڑے پیمانے پر فوجی طیاریاں کر رہا ہے اور اس کے اخراجات برداشت کرنا ملک کی اقتصادی استعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ الغرض اسوقت ترکی خود مختاری اور آزادی کو امریکہ کی طرف سے سخت خطرہ میں ہے۔

ترکی نے امریکی "امداد" قبول کر کے اور امریکی فوجی مشینوں کو اپنے ملک میں داخل ہونے کی اجازت دیکر اور انھیں قرضہ کی رقم پر کنٹرول رکھنے اور ہدایات دینے کے وسیع اختیارات دے کر اپنے آپ کو امریکنوں کے حوالے کر دیا ہے۔ اور اب امریکہ ترکی کو مشرق ادنیٰ اور مشرق وسطیٰ میں اپنے جنگی اڈوں کی طرح استعمال کر رہا ہے۔ آج بھی پہلے کی طرح ترک فوجوں کا اپنا جنرل اسٹاف نہیں ہے۔ بلکہ اس کی جگہ امریکی جنرل اسٹاف کے نمایندے ہیں جو ترکوں کے تمام معاملات کا آخری فیصلہ کرتے ہیں۔

(تاس ایجنسی)

شرم وحیا کا فلسفہ

حیا وہ جذبۂ فطری ہے جس سے مغلوب ہو کر انسان اپنے تمام جسم یا جسم کے مخصوص حصوں کو دوسروں کی نظر سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگرچہ یہ جذبہ دونوں جنس میں مشترک ہے مگر یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ جنس لطیف کی فطرت میں قدرت نے اس کا نسبتاً زیادہ حصہ ودیعت کیا ہے۔ لہذا یہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے جنس لطیف کی خاص ثانوی صنفی خصوصیت تسلیم کی جا سکتی ہے۔ جس عورت میں اس شے لطیف کی کمی ہو اس میں نارمل اور اوسط مرد کے لئے صنفی کشش کا فقدان لازمی ہے۔ مستثنیات اس کلیہ کی اہمیت پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ بعض عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں حیا نام کو بھی نہیں ہوتی پھر بھی وہ مردوں کی شیفتگی و فریفتگی کی باعث ہوتی ہیں۔

مردانہ جذبات کو مشتعل کرنے میں حیا کی کس قدر اہمیت ہے اس کا جایزہ لینے میں ان ممتاز نفسوں کی تحریروں کا حوالہ دینا ضروری ہے جن کو اس موضوع پر کافی دسترس حاصل ہے۔ کنیبرے نوا بیان کرتا ہے کہ جب اسے برن کے حمام میں جانے کا اتفاق ہوا تو اسنے حسب رواج بہت سی پیش خدمتوں میں سے ایک نوجوان لڑکی کو پسند کیا جس نے اس کے اور اپنے کپڑے اُتارے اور حمام میں داخل ہو کر اس کے سارے جسم کو دھویا اور مالش کی۔ اس دوران میں دونوں خاموش رہے۔ غسل سے فارغ ہو جانے کے بعد اس نے دیکھا کہ لڑکی اس کی دراز دستیوں کی منتظر تھی۔ وہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ مجھے یہ خیال کر کے حیرت ہوتی ہے کہ ایسے موقعہ پر میں اپنے دامن کو آلودہ ہونے سے کیسے بچا سکا حالانکہ اس لڑکی میں وہ تمام دلربائیاں اور کافر ادائیاں تھیں جن پر جان نثار کرنا ہر مرد کے لئے باعث صد افتخار ہے۔ خوبصورت چمکیلی آنکھیں۔ ننھا سا منہ، نازک ہونٹ۔ صبیح صورت۔ موتی جیسے آبدار دانت، اُبھرا ہوا سینہ اور سب سے بڑھ کر اٹھارہ سال کی اُٹھتی جوانی۔

ہیولاک ایلس لکھتا ہے کہ محبت تہذیب کا معجزہ ہے۔ وحشی اقوام میں وحشیانہ محبت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ شرم و حیا ہی ہے جو محبت کے لئے تصور کا میدان کھول دیتی ہے۔ اور اس میں نئی روح پھونک دیتی ہے۔ مائیں آیندہ محبت کرنے والوں کی مسرت کا ابتدا ہی سے مطالعہ شروع کر دیتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ عہد طفلی ہی سے اپنی لڑکیوں کو حیا کی تعلیم دیتی ہیں۔ ایک کمزور دل اور نازک مزاج عورت کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی روحانی تکلیف نہیں ہو سکتی کہ وہ

مرد کے سامنے ایسی حرکت کرنے پر مجبور ہو جس پر اسے شرم کا اظہار کرنا چاہیئے تھا۔ اگر اس عورت میں خودداری ہے تو یقیناً وہ اس پر موت کو ترجیح دے گی۔

عورت کی لغزشوں سے فایدہ اُٹھانے والا مرد عورت کی نظر میں ہزار اچھا ہو لیکن عورت کا بذات خود دیدہ و دانستہ کمزوری کا اظہار کرنا مرد کے طبع نازک کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ اگر عورت اپنے حسن کی تمام رعنائی اور اپنے دلربا یا نہ انداز و ادا کی تمام زیبائی تہایت بے باکی سے مرد پر نچھاور کر دے اور مرد اس کی اس جسارت کے باوجود متاثر اور اسکی طرف ملتفت نہ ہو تو عورت کے دل میں شکوک پیدا ہوں گے۔ عام سطح سے بلند عورتوں کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ اگرچہ وہ مرد اور حسن پر جان دینے کو طیار ہیں مگر اپنے جذبات اور دلی کیفیات کو ہرگز ظاہر نہ ہونے دیں گی۔ انتہائی ضبط سے لیکر مرد کے دل کو اپنی طرف مایل کرنے کی کوشش کریں گی۔

ہماری تحقیق اور تدقیق کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ صنفی حیا کی قوت ضبط اپنی ترقی پذیر یوں وسعتوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ صرف جنسی جذبات کی بالیدگی، نشوونما اور نکھار پر ہی نہیں بلکہ اس لطیف اور ہمہ گیر حصہ پر بھی اثر انداز ہوئی ہے جو کہ جنسی جذبات نے ثقافت انسانی کی ارتقا میں لیا ہے۔

اسٹینلے ہال اور آلن لکھتے ہیں۔ "اس میں شک و شبہ کی گنجایش نہیں کہ مذہب آرٹ اور زندگی میں جو شے سب سے ارفع و اعلیٰ ہے اس کا زیادہ تر حصہ اپنے حُسن کے لئے احساس جنسی کی روز افزوں بالیدگی کا ممنون ہے۔

جسم کے بعض حصوں کو مستور رکھنے کے خیال سے آنکھ، بال، چہرہ، رنگ روپ اور لباس میں خوبصورتی پیدا کرنے کا احساس پیدا ہوا۔ اکثر وحشی رقص، وحشیوں کے لباس اور ان کے انداز و ادا جنسی عمل کے مظہر ہیں۔

اکثر ماہرین نفسیات نے حیا کو لباس کا نتیجہ تسلیم کیا ہے۔ لیکن اس نظریئے میں کوئی استقامت نہیں ہے کیونکہ بہت سی قومیں ایسی ہیں جو مادر زاد عریاں رہنے پر بھی شرم و حیا کا احساس رکھتی ہیں۔

اب حیا کی عہد بہ عہد ارتقا پر روشنی ڈالی جائے گی اور اس کے تجزیہ کی کوشش کی جائے گی۔ اس سلسلہ میں حیات کے متنوع مظاہرات سے متعلق چند ضروری باتیں جان لینا ہماری بحث کے لئے مفید ہوگا۔

جزایر سالومن کے نیوجارجین جو ظروف سازی اور پارچہ بافی کے فن سے بھی واقف نہیں ہیں اور جو عضو مخصوص کو پوشیدہ رکھنے کے سوا اور کسی اہتمام کی قطعی ضرورت کا احساس نہیں رکھتے۔ ان میں بھی حیا کا معیار وہی ہے جو مہذب لوگوں میں ہے (Somerville)

Pentlew جزیرے میں یہ قصہ مشہور ہے کہ Kankarenga دیوتا اور اس کی بیوی نے انسان کی تخلیق کی۔ دیوتا مرد پیدا کرتا تھا اور دیوی کے سپرد عورتیں بنانے کا کام تھا۔ جب بیوی عورت کا اندام نہانی بنا رہی تھی تو دیوتا کو یہ عضو دیکھنے کی خواہش ہوئی۔ چنانچہ اس نے بیوی سے یہ خواہش ظاہر کی لیکن بیوی برافروختہ ہو گئی اور

دکھانے کے لئے طیار نہ ہوئی۔ اسی روز سے عورتیں اس عضو کو پتوں سے چھپا لیتی ہیں اور مرد ننگے پھرتے ہیں۔

وانسن لکھتا ہے کہ نیوگینی کی عورتیں اگرچہ لباس کا اتنا خیال نہیں رکھتیں لیکن فطری طور پر انھیں اتنی شرم ضرور ہوتی ہے کہ جب وہ کسی مرد کو اپنے عریاں جسم دیکھتے دیکھ پاتی ہیں تو شرما کر منہ پھیر لیتی ہیں۔

اسٹرلنگ لکھتا ہے کہ وسطی آسٹریلیا میں جب میں نے وہاں کی چند نوجوان لڑکیوں کی ننگی تصویر لینی چاہی تو میرے سامنے کپڑے اُتارنے کو طیار نہ ہوئیں۔ اور جب ایک دیوار کی آڑ میں کپڑے اُتار آئیں تو پھر انھیں میرے سامنے کھڑے ہونے میں کوئی جھجھک نہ ہوئی۔

ڈالٹن لکھتا ہے کہ آسام کی ناگا عورتیں مردوں کے سامنے آتے وقت اپنے سینوں کو ضرور چھپا لیں گی۔ لیکن انھیں جسم کے کسی اور حصہ کو چھپانے کی ضرورت نہیں۔

لنکا میں عورتیں کھلی جگہوں میں نہاتی ہیں لیکن اپنے کپڑے نہیں اُتارتیں۔ کپڑے کے نیچے ہی نیچے جسم کے ہر حصہ کو ملکر دھو لیتی ہیں جیسا کہ ہندوستان میں بھی عام طور سے دیکھا جاتا ہے۔

یگنڈا کے عام باشندے ستر پوشی کا بہت خیال رکھتے ہیں وہاں کی ملکہ دربار عام میں بالکل عریاں جلوہ افروز ہوتی ہیں۔ Crawford Arrow جس نے کئی سال تک وسط افریقہ میں رہ کر اس کا مطالعہ کیا تھا۔ لکھتا ہے "میرا تجربہ ہے کہ یہاں کے لوگوں میں جتنی ہی زیادہ عریانی ہے اور ان کے رسم و رواج ہمارے لئے جتنے ہی بے حیائی کی حد کو پہونچے ہوئے ہیں۔ جنسی تعلقات میں وہ اتنا ہی محتاط رہتے ہیں اور اخلاق کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔" اس نے اس تقریب کا بھی ذکر کیا ہے جو وہاں لڑکیوں کے سن بلوغ کو پہونچنے پر منائی جاتی ہے۔ اور انھیں شادی کے تمام پوشیدہ نکات سمجھنے کا موقعہ دیا جاتا ہے، بڑی خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ رقص و سرود کی محفل گرم ہوتی ہے۔ ناچ گانے میں بالتفصیل مباشرت کے رازہائے پنہاں کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس میں انھیں کوئی شرم نہیں محسوس ہوتی اور ایسا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں لیکن باوجود ان تمام عریاں مظاہروں کے وہاں کی عورتیں بڑی ہی باعصمت ہوتی ہیں۔

قسطنطنیہ کی سڑکوں پر عورتیں اپنے کپڑے اُٹھا کر عضو مخصوص کو کھجا لیتی ہیں۔ ترکی طوائف مباشرت کے وقت چہروں پر نقاب ڈالے رہتی ہیں۔

نیبر لکھتا ہے کہ فرات کے کنارے پہونچا جہاں عورتیں غسل کر رہی تھیں، مجھے دیکھ کر انھوں نے اپنے چہرے چھپا لئے لیکن ان کے جسم کے اور حصے میری نظروں کے سامنے تھے۔

چین کی عورتوں کی خوبصورتی انکے پاؤں میں ہوتی ہے لہذا ان کے ننگے پاؤں شاید ہی کوئی دیکھ سکتا ہے۔ وہاں کے مردوں کے لئے ان کی بیوی کے پاؤں میں ان کے چہروں کی بہ نسبت زیادہ کشش ہوتی ہے۔

جاپان میں اکثر جگہ عورتیں کھلی جگہوں میں غسل کرتی ہیں اور ان کے جسم کو مرد ملتے اور دھوتے ہیں۔ ڈاکٹر کارل ڈیوڈسن

لکھتا ہے کہ میں جاپان کے عریاں رقص سے کافی محظوظ ہو چکا ہوں لیکن مجھے حیرت ہے کہ ان میں حالت عریانی سے جمالیاتی حظ حاصل کرنے کی حس ہی نہیں۔

جرمنی میں قمیص کا استعمال سب سے پہلے سولھویں صدی میں ہوا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ سولھویں صدی کے قبل عام طور سے عریاں رہنا معمولی بات تھی۔ سونے کے وقت ہر شخص کپڑے اُتار لیتا تھا۔ دیہاتی اور شہریوں کے ناچ میں چھلانگیں مارنے کا رواج تھا۔ مرد رقاص کے لئے رقاصہ کو ہوا میں اتنا اوپر اُٹھا لینا کہ اس کا لہنگا پھیل جائے بہت ہی مقبول تھا۔ عہد وسطی میں عورتیں سایہ نہیں پہنتی تھیں اور سترھویں صدی میں بھی صرف اطالیہ کی عورتیں زیریں پاجامہ پہنتی تھیں جو عام لوگوں کی نظروں میں بدعت کا درجہ رکھتا تھا۔ اور اسی صدی میں فرانس اور انگلستان عورتوں کو بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا کیونکہ عورتیں بچہ جننے میں مدد دینے کے لئے کافی تعلیم یافتہ نہ ہوئی تھیں اور شرم کی وجہ سے مرد ڈاکٹر کی مدد حاصل کرنا مشکل تھا۔ لوئی چہاردہم کی معشوقوں کے علاج کے لئے اگر ڈاکٹروں کو اجازت ملتی تھی تو ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دیجاتی تھیں اور بادشاہ وہیں چھپا رہتا تھا اور عورت کے چہرے پر نقاب ڈال دیا جاتا تھا۔

Carr and نے دوران سیاحت میں وینس میں دیکھا کہ بیویاں اور بیوائیں اور دوشیزائیں اپنے سینے کھول کر پھرا کرتی تھیں۔ شمالی اطالیہ کا ایک واقعہ ہے کہ کسی گھر میں آگ لگی جس میں دو لڑکیاں ننگی سوئی ہوئی تھیں۔ اس میں سے ایک عریانی کی حالت میں بھاگی اور بچ گئی دوسری بغیر کپڑا پہنے نہ نکل سکی اور آگ کے شعلوں کی نذر ہو گئی۔

حیات کے ان متنوع مظاہرات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا سہل ہے کہ حیا خوف سے پیدا ہوتی ہے۔ حیا اور خوف کا تعلق پرانا مشاہدہ ہے جو اسپنسر من کی تصانیف میں بھی ملتا ہے لیکن تحقیق جدید کے مطابق حیا جسم کی کمزوری کا دوسرا نام ہے۔ دراصل حیا دو مختلف اور اہم خوفوں کے اجتماع کا نام ہے۔ ایک وہ جو انسان کے پیدا کئے ہوئے خوف سے قبل کا ہے جسکو صرف عورتیں مہیا کرتی ہیں اور دوسرا خوف صریحاً انسانی اور معاشرتی ہے جس میں جنسیت کا شائبہ تک نہیں۔

بچہ اگرچہ بعض وقت جھینپتا ہے مگر بذات خود اسے حیا کا مطلق حس نہیں۔ بچوں کی گفتار اور کردار کی تکلیف دہ بے موقعگی اور بزرگوں کے بتائے ہوئے شرم وحیا کے اصول کی معصومانہ خلاف ورزی سے ہر شخص واقف ہے۔

جولیس موزز بیان کرتا ہے کہ عضو جنسی کو برہنہ کرنے میں جو شرم محسوس ہوتی ہے وہ چار سال کی عمر سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن اس مظہر سے تعلیم کے اثرات اور مثال کی کارروائی کو علیحدہ کرنا مشکل ہے۔ تہذیب یافتہ طبقوں میں شرم وحیا کی پابندی اسکے فطری احساس سے قبل شروع ہو جاتی ہے۔

Bell کا تجربہ ہے کہ نو سال کی عمر سے قبل محبت کے معاملہ میں لڑکیاں ہی پیش پیش رہتی ہیں اور اسی عمر میں انہیں شرم کا احساس ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شرم وحیا کا فطری احساس سن بلوغ کو پہونچ کر ہوتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ احساس شرم صنفی احساس کے مترادف ہے بلکہ اس احساس میں ہیئت اجتماعی کا بھی کافی حصہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حیا اور احساس جنس میں چولی دامن کا ساتھ ہے جس کی مثال انسان تو انسان حیوان تک میں بھی ملتی ہیں۔ جب کسی کتیا کے پاس کتا اس وقت آکر دم ہلائے جس وقت اس پر شہوانیت غالب نہ ہو تو وہ زمین پر بیٹھ جاتی ہے۔ لیکن یہی کتیا جنسی ہیجان کے وقت شرم وحیا کو دور ہٹا دیتی ہے ——————

—————— اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے جنسی مرکز کو نر کی بے وقت دراز دستی سے محفوظ رکھے۔

مرد اپنے جنسی تعلقات میں فطری طور پر جارحانہ اقدام کرتا ہے اور عورتوں کا انداز مدافعانہ ہوتا ہے جس کا لازمی اور ناگزیر نتیجہ شرم ہے۔ وہ اسی حربہ سے کچھ ہی دیر کے لئے سہی خود کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔

جنسی عمل کے وقت عورت اور مرد دونوں پردے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تاکہ رقیب کی نگاہوں سے محفوظ رہیں اور اغلب ہے کہ شرم کا یہ بہت ہی اہم جنسی عنصر ہو —— جانور بھی ایسے وقت گوشۂ تنہائی میں چلے جاتے ہیں لیکن انسان کے ساتھ رہ کر یہ جذبہ جانوروں میں بھی فنا ہو جاتا ہے۔

شرم کے جنسی عنصر ہی نے ناز و نخرہ، عشوہ و انداز کو جنم دیا۔ دوشیزائیں شرماتی اور لجاتی ہیں، اپنے عاشقوں کے سامنے جانے سے کتراتی ہیں۔ مردوں سے ملاقات کے وقت اپنے متین چہرہ سے بے اعتنائی اور بے غرضی کا اظہار کرتی ہیں یہ سب کیا ہے؟ —— یہ ذریعہ ہے ہمارے جذبات کو مشتعل کرنے کا۔ اس میں پندار حسن کا بھی حصہ شامل ہے۔ اس سنجیدگی اور متانت، عارفانہ بے اعتنائی اور اشتعال انگیزی سے جنس مخالف کو تڑپانا اور لطف اٹھانا مقصود ہے۔

Hamilton کہتا ہے دنیا کی کوئی شے جذبات شہوانی کو اس قدر مشتعل نہیں کر سکتی جتنا کہ ایک دوشیزہ جب وہ کسی خارجی یا داخلی قوت کے زیر اثر لجانے کی کوشش کر رہی ہو۔ جتنی ہی زیادہ وہ باحیا ہوگی اتنی ہی زیادہ جذبات میں ہیجان پیدا کر سکتی ہے۔

لیکن شرم کا یہ بنیادی حیوانی عنصر مظاہرات حیا کو ثابت نہیں کر سکتا۔ اس لئے قدرتی طور پر ہماری نظر سماج پر پڑتی ہے اور اب ہمیں سماجی اثر کا جائزہ لینا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ سماجی خصوصیتوں میں جذبہ نفرت ایک پرانی خصوصیت ہے —— جنسی اخراج یا ریزش یا تو بے کار ہیں یا پرانے خیال کے مطابق پر خطر۔ اس لئے غلاظت جسم کے خارج ہونے والے راستے کراہت پیدا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنگلی لوگ بھی ان اعضاء کو چھپاتے اور پوشیدہ طور پر جنسی افعال کے مرتکب ہوتے ہیں۔

جو عورتیں اپنی عصمت کھو چکتی ہیں وہ اس خیال سے شرماتی ہیں کہ مرد انھیں دیکھ کر نفرت نہ کریں۔ شرم کا دوسرا عنصر جو عہد جاہلیت میں زیادہ نمایاں ہے رسمی عنصر ہے جس کی بنیاد فوق الفطرت اثرات پر قایم ہے۔ امبن جزیرے میں

لوگ درختوں پر جنسی عضو کی شکل بنا دیتے ہیں تاکہ درخت بارآور بھی ہو اور چوروں کے دست برد سے بھی محفوظ رہے

لباس کی ابتدائی نفسیاتی اساس شرم کے اس جذبہ پر قایم تھی جس کی تکمیل ان عناصر سے ہوئی جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ وہ جذبہ جو مادہ جانوروں کو زمین پر بیٹھ جانے پر مجبور کرتا ہے زیادہ شستہ اور ترقی یافتہ ہوکر لباس، زیورات اور عشوہ و انداز کے رنگ میں رونما ہوتا ہے۔ مرد کے حرکات سے مدافعت کے اس اضطراری جذبہ کا اس کی آنکھوں سے محفوظ رہنے کی مدافعت میں تبدیل ہوجانا یقیناً ترقی پذیر ہے۔

اکثر عریاں یا نیم عریاں قوموں میں دیکھا جاتا ہے کہ عورتوں میں ان کے سینے سب سے پہلے حیا کے مرکز بن جاتے ہیں مہذب قوموں میں زنانہ لباس کی وضع کے دو مقاصد ہوتے ہیں۔ ایک تو ستر پوشی اور دوسرے جنس مخالف کے لئے سامان کشش مہیا کرنا۔ مردوں کو دل میں نفرت نہ ہو اسی خیال بلکہ اسی خوف سے کشش کو انتہائی عروج پر پہونچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

آسٹریلیا کے وحشی قبایل عضو مخصوص کو اس لئے چھپاتے ہیں کہ یہ اور نمایاں ہوجائے۔ Montaine لکھتا ہے کہ بہت سی چیزیں نمایش کے لئے چھپائی جاتی ہیں۔ تو گویا Trademark اور دوسرے نفسیوں کا نظریہ کہ لباس کا استعمال صرف ستر پوشی کے لئے نہیں بلکہ خاص خاص حصۂ جسم کو جنسی ہیجان کے لئے نمایاں ہوتا ہے پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتا ہے۔ لباس اور زیور کو حیا کی خاص وجہ قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن لباس کے ساتھ جو احساسات پیدا کرنے کیلئے ہوتے ہیں وہ حیا کے جزو لازم ضرور ہیں — عظیم الشان فنکارانہ انتہا پسندی جو زیور اور لباس سے ظاہر کی جاتی ہے اس دعویٰ کی کافی دلیل ہے کہ ایسی چیزیں پردہ کے بجائے کشش کی ایک دنیا لئے ہوتی ہے۔ لباس کی محض موجودگی، خودداری شرافت اور جنسی لطافت کا مطلوبہ احساس پیدا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی کے جسم سے کپڑا اُتارنا اس کی توہین کرنا ہے۔

لباس کا مسئلہ حل کرلینے کے بعد اب ہماری نظر سماجی اور معاشی عنصر کی طرف مبذول ہوتی ہے میرا مقصد انسان کے اس تصور کی ترقی سے ہے کہ عورت مرد کی ملک ہے۔ شوہر غیر منطقی مگر فطری طور پر سوچتا ہے کہ لباس اس کی مقبوضہ کو اخلاقی اور جسمانی طور پر محفوظ رکھتا ہے۔ جب ملکیت کے اس تصور میں وسعت ہوئی اور باپ کو بیٹی پر شوہر کو بیوی پر پورا اختیار ہوگیا تو اس مقصد کا اطلاق کنواری اور بیاہی دونوں پر ہونے لگا۔ اس معاشی فیکٹر نے جذبۂ حیا میں ایک نئے اخلاقی قدر کا اضافہ کیا۔ عورت چونکہ خود کو دوسرے کی ملکیت سمجھتی ہے اس لئے اپنی عصمت کو محفوظ رکھنا اس کے لئے لازمی ہوجاتا ہے تاکہ غیر شخص اس کی عصمت سے ناجایز فایدہ نہ اُٹھا سکے۔ اسی وجہ سے بچیوں کو بچپن ہی سے حیا کی تعلیم دیجاتی ہے۔

چودھویں صدی میں لینڈری نے اپنی کتاب میں اپنی لڑکیوں کو ہدایتہً لکھا تھا "ہر عورت کو مذہب کی رو سے تنہائی اختیار کرنی چاہئے خواہ وہ لباس بدلنے میں ہو یا غسل کرنے میں ہرگز ہرگز اپنے گیسو، گردن، سینہ یا دوسرے حصۂ جسم کی نمایش نہ کرنی چاہئے"

لیکن مسیحی اخلاقی تعلیم کے ذریعہ بھی انتہا پسندیوں میں اعتدال قایم کیا گیا اور دوسری چیز جو اثر انداز ہوئی معیار نجابت تھا۔ اس نظریہ کے تحت عورتوں کو لوگ تہذیب و تمدن کی تمام تر نزاکتوں اور لطافتوں، زیبائیوں اور رعنائیوں کی نمایندہ تصور کرتے تھے۔ گویا اس طرح متضاد جنسوں کو ایک دوسرے سے بے پروا بنانے کے خلاف جہاد شروع ہوگیا۔

جب جہالت کی تاریکی دور ہوئی اور تہذیب کی روشنی پھیلی تو احساس شرم میں بھی ایک جدید خصوصیت کا اضافہ ہوا۔ وہ خصوصیت معاشری رسوم کی زیادتی ہے۔ تہذیب حیا کے دایرہ کو وسیع کرتی ہے اور اس کے اقدار میں تبدیلیوں کے مواقع بہم پہونچاتی ہے۔

سترھویں صدی کا فرانس اور اٹھارھویں صدی کا انگلستان یورپ میں آغاز تہذیب کی نمایندگی کرتے ہیں۔ حیا کی معمولی باریکیوں کو نمایاں کرنے میں دونوں نے بڑی توجہ صرف کی۔ مقبول عام اور مشہور نام ادباء انگلستان مثلاً اسٹرن اور سوفٹ کی تصانیف کے انداز تحریر اور استعمال ڈیش (—) یا نجمہ (⁂) حیا کے ایک نئے احساس کے شاہد ہیں۔ نئے احساس شرم کی وجہ سے ادبی عیاشی کی بالکل نئی خصوصیت جس کے ابھی تک Sterne استاد مانے جاتے ہیں وجود میں آئی۔ کاہل اور بیکار لوگ عموماً عورتیں جو زندگی کے ٹھوس حقایق سے دور تھیں اور جو صرف کتابی علم رکھتی تھیں انھوں ہی نے حیا کے اصول مرتب کئے۔ اور وہی اس کو ہمیشہ وسیع تر کرتی گئیں۔ وقتاً فوقتاً انداز و ادا گفتار و رفتار میں باریکیوں اور دلربائی کے نئے نئے طرز ایجاد کئے گئے۔ اور اس میں اس قدر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں کہ ذوق سلیم کے لئے ناقابل برداشت ہوجاتی ہیں۔

شاید یہی وہ دور تھا جب کہ خانگی طور پر استعمال کرنے کے لئے نئے الفاظ وضع کئے گئے تاکہ اعضاء جسمانی اور اعمال جنسی کو اشاروں کنایوں میں ظاہر کیا جاسکے۔ اس قسم کی مخفی عامیانہ زبان جس کا عروج خصوصاً عورتوں میں اور دو محبت کرنے والوں میں آزادانہ طور پر ہوا آجکل عالمگیر ہے۔

سترھویں صدی میں سوچنے کے منطقی اور استدلالی طریقہ کے عروج نے اور اٹھارھویں صدی میں اقلیدسی، ریاضی اور فنی علوم کی ترقی نے ملکر فرانس کے اس عالمگیر عقیدے کو جنم دیا کہ انسانی رسوم اور سماجی اصول کی بنیاد خالص منطق اور عقل پر ہونی چاہئے۔ ان مدعیان منطق نے جایز اور فطری جذبات کے دعویٰ کو پس پشت ڈال دیا جس کی انیسویں صدی نے بعد میں چھان بین کی اور اسے ترقی دی۔ اٹھارھویں صدی کے ممتاز اور جاں باز دماغوں نے اس مسئلہ پر جو رائے قایم کی وہ مشہور شاعر سنٹ ہلبرٹ کے اس نظریہ سے صاف ظاہر ہے کہ "کوئی شخص معصومیت کے بارے میں بغیر فحش کلمات استعمال کئے کچھ کہہ ہی نہیں سکتا"۔ شرم کے اس تصور نے یونانی وضع کے اس اختراع سے ملکر وہ پائداری حاصل کی کہ اس صدی کے اواخر میں عورتیں اپنی صحت سے بے پروا ہوکر ایسے جاذبدار کپڑے پہننے لگیں کہ جسم کا ایک ایک بال نظر آجائے۔ اس صدی کی تبدیلیوں کا آخری نتیجہ یہ نکلا کہ احساس شرم یکلخت محو نہیں ہوگیا بلکہ اس نے ایک زیادہ واضح احساس کی طرف رہنمائی کی کہ اس کی نامیاتی بنیاد میں کیا چیز دایمی اور ابدی ہے اور اس کے بدلتے ہوئے مظاہر میں کیا چیز محض وقتی ہے۔

اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ حیا ایک مبہم مگر وہ زبردست اور وسیع قوت ہے جو ہر قوم اور ہر قبیلہ کے رگ و پے میں جاری وساری ہے۔ لیکن مہذب دنیا میں جو کوئی بھی شرم و حیا کو انسانی ضرورتوں پر ترجیح دیتا ہے، ہدف ملامت و نفرت بنتا ہے۔

یہ ہے مغربی ماہرین نفسیات کے مشاہدات، نظریات، تصورات اور تجربات کا خلاصہ اب میں خالص مشرقی نقطۂ نظر سے چند مغربی ممالک کے عہد بہ عہد بدلتے ہوئے شرم و حیا کے معیار، مردوں عورتوں کے عام تعلقات اور ان کے اثرات سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

قدیم قوموں میں اہل یونان ہی تہذیب کے اعتبار سے سب سے نمایاں اور ممتاز نظر آتے ہیں اس قوم کے ابتدائی دور میں اخلاقی نظریہ کے اعتبار سے عورت کی حیثیت بہت گری ہوئی تھی۔ لیکن تمدنی ارتقا کے ابتدائی مراحل میں تہذیب اور علم کی روشنی کا یہ اثر ہوا کہ عورت کی عصمت بھی قابل قدر سمجھی جانے لگی۔ زنانخانے مردانخانوں سے الگ ہونے لگے۔ لیکن یہ روشنی شاید پھو لجھڑی کی وقتی روشنی تھی جو فوراً تاریکی میں بدل گئی اور رفتہ رفتہ اہل یونان پر نفس پرستی اور شہوانیت کا غلبہ شروع ہوا۔ شہوانیت کی اشتعال انگیزی میں ذوق جمال اور حسن پرستی نے کافی اعانت کی۔ پھر تمدن کی ترقی نے جب آرٹ اور ذوق جمال کے پردہ میں عریانی کو سراہنا شروع کیا تو شہوانی جذبات کا اشتعال حد سے بڑھ کر غیر فطری طریقہ تسکین کی تلاش کرنے لگا اور اس میں یہ قوم اس قدر محو ہوئی کہ پھر اس ابدی خواب سے بیدار نہ ہو سکی۔

اہل روم کے اخلاقی معیار میں وہی نشیب و فراز ہوئے جو ہم یونانیوں میں دیکھ چکے ہیں، یہاں بھی ایک زمانہ تھا جبکہ عورت کو خاندانی نظام کے شکنجہ میں کس دیا گیا تھا۔ لیکن تہذیب کی ترقی نے یہاں بھی وہی گل کھلائے۔ عریانیت اور شہوانیت کا سیلاب امڈ آیا۔ ہر جگہ بے حیائی کے مظاہرے ہونے لگے اور یہ بہیمی خواہشات کی غلامی اور بے حیائی تھی جس نے اس قوم کو قعر گمنامی میں ڈھکیل دیا۔

اٹھارھویں صدی عیسوی میں یورپ کے اہل قلم نے سوسائٹی کے خلاف انفرادی حقوق کے لئے آواز بلند کی سماج سے عورتوں اور مردوں کے مساویانہ حقوق منوائے۔ عورتوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں مردوں کے دوش بدوش کام کرنیکا موقعہ دیا گیا۔ اس طرح گویا مردوں اور عورتوں نے مردوں کے جذبات جنسی کو ابھارنے کے لئے خود کو جاذب نظر بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ حسن و جمال کی نمائش سے خاطر خواہ تسکین نہ ہوئی تو کپڑوں سے باہر نکل آئیں۔

ہندوستان کے معیار حیا و شرم کی تاریخ اور اس کی تبدیلیوں کا جائزہ لیتے وقت سب سے پہلے ہماری نظر ہندوستان کی مذہبی کتاب کام شاستر پر پڑتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ عورتیں مندروں میں جاکر مندر کے پجاریوں سے ہم بستر ہو کر اولاد پیدا کیا کرتی تھیں۔ پھر مندروں کے در و دیوار پر جو ننگی تصویریں اور مجسمے نظر آتے ہیں ان سے صاف ظاہر ہے کہ ان کا مقصد عورتوں اور مردوں کی جنسی اشتعال انگیزی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مندر کی دیو داسیوں اور ان کے عریاں رقص سے ہر شخص واقف ہے۔ ہولی کے کھیل، دریاؤں کے نیم عریاں اشنان ہندوستانی حیا کی پست معیار ہی کی عام مثالیں ہیں

ہندوستان میں جب مسلمانوں کی حکومت کا دور دورہ تھا اسوقت مسلمان حکمرانوں نے تعلیمات اسلام کے مطابق پردہ کا رواج دیا اور ہندوستان کو حیا کے صحیح مفہوم سے روشناس کرایا۔ چنانچہ زیادہ زمانہ نہیں گزرا جب کہ عورت کے پردے کو ہر شخص شرافت اور عزت کی علامت سمجھتا تھا۔ جو عورت جتنی زیادہ ذی عزت ہوتی تھی اس کے پردے میں اتنا ہی زیادہ اہتمام ہوتا تھا۔ نیچے طبقہ کی عورتیں بھی اگرچہ پردہ نہ کرتی تھیں پھر بھی مردوں سے دور رہتی تھیں۔ لیکن شومئی قسمت سے ہم لوگ اس قوم کے غلام ہو گئے جس نے اپنی لغت سے حیا کا لفظ ہی نکال دیا تھا۔ ان سے ہندوستانی اس قدر مرعوب ہوئے کہ انھوں نے اپنی ترقی کا یہ سہل راستہ سوچ لیا کہ مغربی تہذیب و تمدن کے مظاہر کا عکس اپنی زندگی میں اُتار لیں۔ یہی بحرانی کیفیت کا زمانہ تھا جس میں مغربی لباس، آداب و اطوار اور چال ڈھال کی نقل اُتاری گئی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان کی سیاست میں ایک زبردست انقلاب رونما ہوا جس میں عورتیں بھی مدد دینے کے لئے میدان عمل میں کود پڑیں۔ انگریزوں کی ظاہری چمک دمک سے مرعوب ہو ہی چکی تھیں۔ ان کے رنگ میں رنگ جانے انکی روش پر چلنے، انھیں کی طرح سڑکوں پر بے باکانہ پھرنے اور کلبوں میں مردوں کے دوش بدوش کھیلنے کی خواہش قبل ہی سے دل میں تڑپ رہی تھی — اب ان سیاسی تحریکوں نے انھیں کھل کھیلنے کا موقعہ دیا۔ آزادی حاصل کرنے کے لئے عورتوں میں عام اور اعلےٰ تعلیم کی ضرورت تھی۔ سماج نے اجازت دے ہی دی۔ اب کیا تھا مردوں اور عورتوں کی مخلوط تعلیم، مخلوط جلسے، مخلوط ملازمتیں اور مخلوط کھیل اور ہر جگہ اختلاط اور اجتماع ناگزیر ہو گیا۔ جنسی مہیجات کے لئے زمین ہموار ہو گئی۔ اس پر طرہ یہ کہ ملک کے ادبا نے مارکسی نظریات اور فرائڈی مزعومات کے زیر اثر اپنے افسانوں، ڈراموں اور ناولوں کے ذریعہ تصورات مساوات اور جذبات جنسی کو بھڑکایا اور ملک کے رسالوں، اخباروں، اشتہاروں، تفریح گاہوں نے ملکر ان ادیبوں کو سراہ کر، اُچھال کر اور اسکا پرچار کر کے سماجی تخریب میں کافی حصہ لیا

اور اب مہذب دنیا میں بھی عریانیت کا سیلاب اس قدر تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ جس کا جواب نہیں — ہمیں صنفی کشش کی اہمیت سے انکار نہیں مگر یہ معاملات جسقدر ڈھکے اور چھپے رہیں بہتر ہے۔ بہیمیت کی منزل سے موجودہ شائستگی کی جس حد تک ہم آہستہ آہستہ پہونچ چکے ہیں اس کا مطالبہ ہے کہ صنفی رجحانات کو بے باکی سے پردہ کے باہر نہ لایا جائے — جو لوگ حسن کے "نظریۂ افادیت" کے قایل ہیں ان کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ یورپ کا مفروضہ ہے اور یورپ اس کی پوجا کرے، تو کرے لیکن ہندوستان کا خمیر اس کو قبول نہیں کر سکتا۔ عریانیت اور بے حیائی کے پرچار سے ہندوستانیت ہی نہیں بلکہ انسانیت کا خاتمہ ہے اور بہیمیت و سبعیت کی حکومت۔

مختصر یہ کہ اب شرم و حیا کا مفہوم اور عصمت و عفت کا معیار بدل رہا ہے۔ غیر مردوں اور عورتوں کے ملنے کے مواقع بڑھ رہے ہیں۔ ہماری معاشرت کا شیرازہ بکھر رہا ہے۔ اور اگر ہم بے لگام اسی روش پر دوڑتے رہے تو ترقی کے بجائے ہمارا بھی وہی حشر ہوگا جو روم و یونان جیسی عظیم الشان مملکتوں کا ہوا۔

محمد ضمیر عالم

عہدِ حاضر کا قارون

(امریکہ)

سونے کا ذخیرہ آپ کو شاید یقین نہ آئے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس وقت امریکہ کے پاس ۲۲ ارب ڈالر کا سونا لوہے اور کنکریٹ کے گہرے تہ خانوں میں محفوظ ہے۔ ان تہ خانوں کی چھتیں ایسی بنائی گئی ہیں کہ ان پر بم کا اثر بھی نہیں ہو سکتا اور ان کے آہنی دروازے بائیس بائیس ٹن وزن کے ہیں۔

اگر یہ قارونی دولت تمام دُنیا میں تقسیم کر دیجائے تو کیا ہو، اسے کوئی نہیں جان سکتا، لیکن امریکہ اس دولت کے صرف کے متعلق اپنا ایک خاص خیال رکھتا ہے اور وہ یہ کہ دُنیا کو ایک بار اس وقت سے زیادہ اقتصادی خطرہ میں پڑنا ہے اور اس وقت امریکہ اس دولت کے ذریعہ سے افراطِ زرِ کاغذی (Inflation) کا مقابلہ کرے گا۔

۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۶ء تک کامل تیرہ سال امریکہ نے اتنی زبردست خریداری سونے کی کی ہے کہ دُنیا میں جتنا سونا اسے مل سکا، زیادہ سے زیادہ قیمت دیکر لے لیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کناڈا، افریقہ، آسٹریلیا اور چین کی معدنوں سے جتنا سونا نکالا جا سکتا تھا وہ نکالا جانے لگا اور امریکہ نے اس کو مول لیکر اپنے تہ خانوں میں بھر دیا۔

یہ سونا ایک سایز کی اینٹوں میں ڈھال لیا گیا ہے۔ ہر اینٹ کا وزن ۲۷ ½ پونڈ (تقریباً تیرہ سیر) اور قیمت تین ہزار پونڈ (تقریباً ۴۰ ہزار روپیہ) ہے، سونے کا بہت بڑا ذخیرہ فورٹ ناکس (کنٹکی) میں ہے۔ جہاں یہ اینٹیں چودہ تہ خانوں میں محفوظ ہیں اور ہر تہ خانہ کی حفاظت کے لئے علاوہ زبردست فوجی پہرہ کی برقی رو، اشک آور گیس اور خطرہ سے خبردار کرنیکے خاص آلات لگائے گئے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ امریکہ نے سونا اس لئے جمع کیا ہے کہ وہ بہت قیمتی دھات ہے، تو یہ غلط ہے، کیونکہ ۲۹ دھاتیں اور ہیں جو سونے سے زیادہ قیمتی ہیں، مثلاً ریڈیم ہی کو لے لیجئے کہ اسکی ایک اونس (ڈھائی تولہ) مقدار ایک ٹن (۲۸ من) سونے سے زیادہ قیمتی ہے۔ اصل سبب یہ ہے کہ سونے کو ساری دُنیا میں دولتمندی کا معیار قرار دیا گیا ہے اور کاروبار پر اسی کے اُتار چڑھاؤ کا اثر پڑتا ہے۔

زر پرستی کی ابتدا — امریکہ میں سونا جمع کرنے کا خبط سب سے پہلے پریسیڈنٹ روزولٹ کو ہوا۔ جس وقت

روزولٹ صدر ہوا تھا اسوقت امریکہ کی اقتصادی حالت اچھی نہ تھی اور ڈالر (امریکی سکہ) کی تجارتی پوزیشن درست کرنے کے لئے اس نے سونے کی قیمت بڑھادی۔ مقصود یہ تھا کہ سونے کی قیمت بڑھ جانے سے چیزوں کی قیمت بڑھ جائے گی اور اقتصادی حالت سدھر جائے گی۔ برطانیہ ۱۹۳۱ء ہی میں سونے کی قیمت بڑھا چکا تھا۔

پھر یہ مقصود تو امریکہ کا پورا ہوا، لیکن اسی کے ساتھ کچھ اور باتیں بھی پیدا ہوگئیں۔ سونے کی قیمت بڑھ جانے سے یہ ہوا کہ سونے کی معدنی پیداوار بہت بڑھ گئی اور معدنوں میں اتنے وسیع پیمانہ پر کام ہونے لگا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ جہاں جہاں سونے کے پائے جانے کا امکان وہاں زمین کو کھوکھلا کر دیا گیا۔ ایک طرف افریقہ و روس، چین و آسٹریلیا وغیرہ میں نئی معدنوں کی جستجو ہونے لگی، دوسری طرف ہندوستان کے رئیسوں کا جمع کیا ہوا سونا بھی تجوریوں سے نکل کر بازار میں آگیا، چنانچہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ ۱۹۳۲ء سے لیکر ۱۹۳۶ء تک ایک ارب ۲۸ کروڑ پونڈ قیمت کا سونا مشرق بعید کے ملکوں کا باہر آگیا۔

پھر یہ سونا کہاں گیا؟ تقریباً سب کا سب امریکہ پہونچگیا کیونکہ وہ طے کر چکا تھا کہ جتنا سونا مل سکے گا وہ سات پونڈ فی اونس کے حساب سے خریدلیگا۔ یہی قیمت برطانیہ نے بھی مقرر کی تھی، لیکن امریکہ کے مقابلہ میں وہ بہت حقیر مقدار خرید سکا۔

جب روزولٹ صدر ہوئے ہیں تو امریکہ میں سونے کا ذخیرہ ۴ ارب ڈالر کا تھا، ۱۹۳۴ء تک اس کی مقدار آٹھ ارب ڈالر تک پہونچگئی اور دوسری جنگ کے اختتام تک سولہ ارب ہوگئی، لیکن امریکہ کی یہ ہوس ختم نہ ہوئی اور خریداری بدستور جاری رہی، یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں اس کی مقدار ۲۳ ارب ڈالر تک پہونچ گئی۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ تمام دنیا کا دو تہائی سونا امریکہ پہونچ گیا لیکن یہ بھوک پھر بھی رفع نہیں ہوئی اور خریداری ہو رہی ہے۔

سونے کی گرانی کا اثر بازار پر

۱۹۳۶ء برطانیہ و امریکہ کے ماہرین اقتصاد میں سونے کی اس زبردست فراہمی کی وجہ سے بے چینی پیدا ہوئی کیونکہ اس کا اثر بازار پر بہت خراب پڑ رہا تھا اس لئے انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس سونے کو تہ خانوں میں بند کر کے رکھ دیا جائے اور بازار میں اس کو نہ لایا جائے، لیکن یہ طریقہ بھی کچھ مفید ثابت نہ ہوا، کیونکہ ایک طرف قلعوں اور تہ خانوں کی تعمیر و حفاظت کا صرف بہت بڑھ گیا اور دوسری طرف امریکہ کو سود کی رقم بینک کو زیادہ ادا کرنا پڑی، کیونکہ بینک ہی سے روپیہ قرض لے لیکر سونا خریدا گیا تھا۔ روزولٹ کی پالیسی یہ تھی کہ سونا جمع کرنے کے بعد اسے پھر بازار میں ارزاں فروخت کیا جائے گا اور اگر اس پالیسی پر عمل کیا جاتا تو سونے کی فراہمی میں کمی بھی ہو جاتی اور اسے تہ خانوں میں بند کرنے کی بھی ضرورت لاحق نہ ہوتی۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ امریکہ کو سونے کی ضرورت بھی نہیں ہے اور اس کی حفاظت کے مصارف بھی بہت زیادہ ہیں تاہم خریداری بدستور جاری ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ امریکہ ڈرتا ہے اگر وہ اپنا جمع کیا ہوا سونا بازار میں لے آیا اور وہ ارزاں قیمت پر فروخت ہونے لگا، تو غذائی اشیاء کی قیمت گھٹ جائے گی اور کاشتکار طبقہ تباہ ہو جائے گا،

دوسری طرف دنیا میں سونے کی تمام معدنوں کا کام بند ہو جائے گا اور تمام صنعتی اداروں اور کمپنیوں کے حصوں کی قیمت گر جائے گی۔

یہ ایک حد تک صحیح ہے اور امریکہ اس خیال سے اپنا جمع کیا ہوا سونا بازار میں نہیں لا سکتا، لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب وہ سونا خریدنا بند کیوں نہیں کرتا۔ یعنی جو سونا اس کے پاس محفوظ ہے اسے فروخت نہ کرے، لیکن آیندہ اس کی خریداری سے تو باز رہے — لیکن وہ یہ بھی نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا نتیجہ اور زیادہ خراب ہوگا، کیونکہ اگر امریکہ نے سونے کی خریداری بند کر دی تو اس کا بھاؤ اور زیادہ گر جائے گا اور پھر وہی اقتصادی دشواریاں پیدا ہو جائیں گی۔

امریکہ سونے کے جال میں

بہر حال امریکہ کو سونا خریدنے کی جو ہوس پیدا ہوئی تھی وہ اب ایک ایسے مرض کی صورت اختیار کر چکی ہے جس کا علاج بظاہر کوئی نظر نہیں آتا۔

اس کا جو اثر برطانیہ اور دوسرے ملکوں پر پڑ رہا ہے اس کی تفصیل تو دشوار ہے لیکن مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ برطانیہ کا رتی رتی سونا امریکہ پہونچ گیا ہے اور آسٹریلیا سے جتنا سونا برطانیہ آتا تھا وہ بھی امریکن ڈالر کی خریداری کے لئے امریکہ بھیجدیا گیا پچھلے سال آسٹریلیا نے ۹۱۰۸۰۰ اونس سونا ایک کرور پونڈ کی مالیت کا برطانیہ بھیجا تھا، لیکن اب ہر ماہ ۴۰ ہزار اونس کا اضافہ اس میں ہوتا جا رہا ہے۔ آسٹریلیا، برطانیہ کو دیتا ہے، برطانیہ، امریکہ کے ہاتھ فروخت کرتا ہے اور امریکہ اسے زمین میں دفن کر دیتا ہے۔

دی مغل لائن لمیٹڈ

(سب سے پرانی ہندوستانی جہاز راں کمپنی)

بحر احمر اور ماریشس

کی بندرگاہوں کو مسافر اور مال لے جانے والے جہازوں کا بیڑہ بمبئی سے :-

عدن، پورٹ سوڈان، جدہ اور مصر

کی بندرگاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ہم حسب ضرورت دوسری بندرگاہوں کو بھی اپنے جہاز بھیج سکیں گے

خاص حج سروس

جو حضرات حج کی سعادت حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں وہ مندرجۂ ذیل پتہ پر اپنی درخواستیں جلد بھیجدیں۔ لیکن یہ امر ملحوظ رہے کہ جہاز میں جگہ ملنے کی گارنٹی نہیں دی جا سکتی :-

ٹرنر مارین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۹ - بنک اسٹریٹ - بمبئی

ہر بات کا جواب دینے والے انسان

ہاتھی کتنا اونچا اُچھل سکتا ہے — سر کا بال کتنا چوڑا ہوتا ہے — دُنیا میں سب سے بڑا کیک کب طیار کیا گیا — یہ اور اسی قسم کے تمام وہ سوالات جن کا جواب دینا مشکل ہے، آپ البرٹ مچل اور بروس چیپ مین سے کر سکتے ہیں جو اس نوع کے پیچیدہ اور دقیق معمے دس سال سے حل کر رہے ہیں اور لندن کے ریڈیو سے نشر کرتے رہتے ہیں۔

وہی آپ کو بتا سکتے ہیں کہ ہاتھی بالکل نہیں اُچھل سکتا۔ بال کی چوڑائی $\frac{1}{8}$ انچ ہے اور دنیا کا سب سے بڑا کیک امریکہ کے ایک گاؤں اورنگین میں طیار کیا گیا جس کا وزن پانچ ہزار پونڈ تھا۔

دُنیا کا کوئی علمی، فنی، تاریخی، سیاسی، مذہبی و جغرافی سوال ایسا نہیں ہے جس کا جواب اُن کے پاس نہ ہو، لیکن وہ اس میں کینوکر کامیاب ہوتے ہیں، اس کا جواب ان کے جوابوں سے زیادہ دلچسپ ہے۔

ان کے پاس ایک لائبریری ہے دس ہزار کتابوں کی، ریسرچ اسٹاف ہے، ۵۰ آدمیوں کا، ۲۰ ہزار فایل ہیں خاص خاص مسایل کے متعلق ماہرین فن کے بیانات کے۔

روزانہ ایک ہزار سے زیادہ سوالات ان کو موصول ہوتے رہتے ہیں ان میں سے اُن سوالات کا جواب جو اس سے قبل ہو چکے ہیں یا جو بہت معمولی ہیں خط کے ذریعہ سے دیدیا جاتا ہے اور جو دلچسپ ہوتے ہیں ان کو ریڈیو کے لئے چھانٹ لیا جاتا ہے۔

ان سوالوں میں بعض اس قدر پیچیدہ ہوتے ہیں کہ ان کا جواب دینے کے لئے ماہرین کو تجربہ کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً ایک بار یہ سوال کیا گیا کہ چیونٹی زیادہ سے زیادہ کتنا تیز دوڑ سکتی ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے ڈاکٹر ولیم برجن نے جو نیویارک کے زولاجیکل سوسائٹی کے ڈائرکٹر ہیں، خاص طور پر شیشہ سے ڈھکا ہوا ایک صندوق طیار کیا اور اس کے اندر چیونٹی کو تیز سے تیز دوڑانے کا انتظام کیا اسٹاپ واچ کے ذریعہ سے اس کی دوڑ کا اوسط ۲۰ فیٹ فی گھنٹہ معلوم کیا گیا۔ یہ صندوق نمایش کے لئے اب بھی برانکس کے جانوروں کے عجائب گھر میں رکھا ہوا ہے۔

ایک بار کسی نے سوال کیا کہ شراب کا بھرا ہوا پیپا پانی میں تیر سکتا ہے یا نہیں۔ اس کا جواب معلوم کرنے کے لئے ڈاکٹر کرو نے ایک پیپا خرید کر پانی میں ڈال کر تجربہ کیا تو پتہ چلا کہ اس کا صرف ایک کونہ پانی سے باہر رہا، باقی حصہ ڈوب گیا تھا۔

ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ دیا سلائی جلانے کے وقت اس کا درجۂ حرارت کتنا ہوتا ہے، اس کا جواب متعدد آلات کے ذریعہ

کئی بار کی تحقیق کے بعد یہ دیا گیا کہ دیا سلائی کا سر اجب جل اُٹھتا ہے تو درجۂ حرارت ۲۵۰۰ ہوتا ہے اور جل اُٹھنے کے بعد شعلہ کا درجۂ حرارت ۲۳۰۰ سے آگے نہیں بڑھتا۔

کسی نے سوال کیا کہ Refrigerator (چیزوں کو ٹھنڈا رکھنے کی الماری) کا دروازہ کھلنے کے وقت اس کی ہوا کا ٹمپریچر کتنا ہوتا ہے۔ اس باب میں نیویارک کی اڈیسن کمپنی نے کافی تحقیق کے بعد معلوم کیا کہ دروازہ کے زیادہ اور کم کھلنے کے لحاظ سے درجۂ حرارت ایک سے تین تک ہو جاتا ہے۔

ایک بار سوال کیا گیا کہ ایک میل تک تیز دوڑنے کے بعد نبض کی رفتار کیا ہو جاتی ہے اور خون کا دباؤ کتنا ہوتا ہے۔ اسکا جواب حاصل کرنے کے لئے گلن کنگھم کے ایک مشہور میل کی دوڑ لگانے والے شخص کی خدمات حاصل کی گئیں اور جب اس نے دوڑ ختم کی تو اس کی نبض کی رفتار بجائے ۷۲ کے ۲۰۰ فی منٹ تھی اور خون کا دباؤ ۱۱۰ سے ۱۲۳ تک پہونچ گیا تھا۔

بعض سوال ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ ان کے متعلق کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہوتا یا پھر صرف قیاس سے کام لیکر جواب دیا جاتا ہے مثلاً ابراہیم لنکن کے متعلق تو معلوم ہے کہ وہ ۱۵ نمبر کا جوتا استعمال کرتا تھا لیکن اور لاکھوں آدمی ہیں جن کے جوتے کی ناپ کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے اور اس لئے ان کے متعلق اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس نوع کے سوالات ایسے ہوتے ہیں:۔ دنیا میں چڑیوں کی تعداد کتنی ہے۔ کیا چڑیاں جمھائی لیتی ہیں، کیا کھٹمل خواب دیکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ایک بار پوچھا گیا کہ ایک بوتل سے فونٹن پن کے لئے کتنی بار سیاہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسی کے جواب میں پارکر کمپنی کی تحقیق کے بعد اطلاع دی کہ ایک باریک نب کا فونٹن پن دو اونس کی سیاہی کی شیشی سے ۹۴۳۵۰۰۰ مرتبہ بھرا جا سکتا ہے۔

ان جواب دینے والوں کے پروگرام نیویارک، چکاگو اور بوسٹن سے نشر ہوتے رہتے ہیں اور سالانہ دو لاکھ ۵۰ ہزار ڈالر ان کو معاوضہ ملتا ہے۔

ان کی کامیابی کا انحصار کئی باتوں پر ہے، ایک یہ کہ انکا ریسرچ اسٹاف ہے جس میں بہت سے خاص خاص فن کے ماہرین اور وسیع معلومات رکھنے والے لوگ شامل ہیں۔ یہ اسٹاف ۳۰ فی صدی جواب تو محض اپنے حافظہ کی مدد سے دیدیتے ہیں اور باقی کے لئے کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ اس قسم کی کتابوں کی کم از کم دو کاپیاں فراہم کی جاتی ہیں، لیکن انسائکلوپیڈیا برٹانکا کے تین سٹ ان کے ہاں موجود ہیں۔

یہ لوگ اس سے بھی باخبر رہتے ہیں کہ دنیا میں کس شخص نے کس موضوع پر تحقیق کی ہے اور اس موضوع کے متعلق اگر کوئی سوال آگیا تو اس سے دریافت کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک بار کسی نے پوچھا کہ "ہنس کے کتنے پر ہوتے ہیں"۔ ان کو معلوم ہوا کہ زراعتی کالج کے ایک طالب علم نے ہنس کے متعلق تحقیق کر کے ایک مقالہ لکھا ہے، چنانچہ اس کا پتہ چلا کر اس سے اس کا جواب حاصل کیا گیا۔

ایک بار نہایت مشکل سوال کیا گیا اور وہ یہ کہ "دنیا کی سب سے پرانی کمپنی کونسی ہے، چھ مہینے کی جستجو کے بعد معلوم ہوا کہ سویڈن کی ایک کمپنی جس کا نام اسٹورا کوپر برگ ہے اور جو معدن سے تانبہ نکالتی ہے، سب سے پرانی کمپنی ہے جو ۱۱۰۰ء میں قایم ہوئی اور اب تک اسی خاندان کی ملکیت میں ہے ۔ بعض اور سوالات اور ان کا جواب ملاحظہ ہو:۔

سوال ۔ فوارہ سے نہانے میں زیادہ پانی صرف ہوتا ہے یا ٹب میں نہانے سے ۔

جواب ۔ ٹب میں نہانے سے دونا پانی صرف ہوتا ہے ۔

سوال ۔ دنیا کا سب سے بڑا گھن یا ہتھوڑا (Hammer) کونسا ہے ۔

جواب ۔ کلیولینڈ (امریکہ) کے ایک ایلومینیم کے کارخانہ میں، جس کا وزن ۱۰ لاکھ پونڈ ہے ۔

سوال ۔ کمر میں پیٹی باندھنے کا رواج عورتوں میں کس نے رائج کیا ۔

جواب ۔ فرانس کی ملکہ کیتھرائن ڈی مڈلیسی نے سولھویں صدی عیسوی میں ۔

سوال ۔ کیا مرغی کے بچے تیر سکتے ہیں ۔

جواب ۔ ہاں، لیکن وہ اسے پسند نہیں کرتے ۔

سوال ۔ کیا جارج واشنگٹن نے کبھی ہاتھی دیکھا تھا ۔

جواب ۔ ہاں، ۲۵ اگست ۱۷۹۶ء کو واشنگٹن نے ایک ہاتھی سرکس میں دیکھا تھا اور پونے دو ڈالر اسکے دیکھنے کی فیس ادا کی تھی۔

نگار بک ایجنسی کی زیر طبع کتابیں

(۱) مکتوبات نیاز کا تیسرا حصہ

۲۸ پونڈ کا ولایتی کاغذ۔ نہایت نفیس طباعت و کتابت۔ خوشنما جلد و گرد پوش اور حضرت نیاز کی تازہ تصویر جون میں شایع ہو جائیگا۔ قیمت چار روپیہ علاوہ محصول۔ لیکن جو حضرات پہلے سے قیمت بھیج دینگے، انسے محصول ڈاک نہیں لیا جائیگا

(۲) ناول کیا ہے؟

فنی و تاریخی نقطۂ نظر سے

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اور ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کے قلم سے

اگر آپ ناول کے مطالعہ کے شایق ہیں یا ناول لکھنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ تاکہ آپ سمجھ سکیں کہ ایک کامیاب ناول کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں ۔ قیمت علاوہ محصول دو روپیہ

مکتوبات نیاز

بکرمی۔

نقشِ نازِ بُتِ طناز بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

اس شعر میں پائے طاؤس اور خامۂ مانی کا باہمی ربط جو آپ نے سمجھا ہے، اس سے مجھے اختلاف ہے آپ فرماتے ہیں کہ ایک ایسے نقش کے لئے جس میں محبوب آغوشِ رقیب میں دکھایا جائے، بجائے خامۂ مانی کے پائے طاؤس کی ضرورت ہے، کیونکہ طاؤس کے پاؤں بہت بدنما ہوتے ہیں اور اس کا بالائی حصۂ جسم بہت خوبصورت ہوتا ہے۔

تشبیہ کی حد تک تو آپ کا فرمانا بالکل درست ہے کیونکہ اگر کسی تصویر میں "محبوب بہ آغوشِ رقیب" دکھایا جائے تو اس کی مثال بالکل نقش طاؤس کی سی ہوگی جس کا بالائی حصۂ جسم بہت خوبصورت اور پاؤں کی طرف کا حصہ بہت بدنما ہوتا ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ غالب کی رائے میں اس نقش کی طیاری کے لئے خامۂ مانی کی جگہ پائے طاؤس ہونا چاہئے، میرے نزدیک درست نہیں۔ کیونکہ پائے طاؤس سے تصویر نہیں بنائی جا سکتی۔ میری رائے میں دوسرے مصرعہ کا مفہوم یہ ہے کہ ایسے نقش کے لئے خامۂ مانی کو پائے طاؤس کی ضرورت ہے، یعنی نقش کے نیچے کا حصہ اسے پائے طاؤس ہی کی طرح بدنما بنانا چاہئے۔

صدیقی۔

جی ہاں، میں نے کلپنا دیکھا اور دو بار دیکھا۔ آپ اُدے شنکر کے متعلق میری رائے چاہتے ہیں یا اُس کے فن کے متعلق۔ غالباً فن ہی آپ کے سامنے ہوگا، لیکن شاید رقص و غناء ہی ایک ایسا فن ہے جس سے صاحبِ فن کی شخصیت کو علٰحدہ کر کے کوئی رائے قایم نہیں کی جا سکتی، اور اس لحاظ سے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس فن کے اختیار کرنے کا اسے کوئی حق حاصل نہ تھا، کیونکہ اس فن سے ہٹ کر جس حد تک خدوخال یا قامت و شمایل کا تعلق ہے وہ کچھ نہیں ہے اور اس لئے اس کا فن بالکل ایسا ہی ہے جیسے مزبلہ پر کوئی پھول پڑا ہو۔

رقص کے باب میں میری رائے عام لوگوں سے ذرا مختلف ہے - وقت تو ضایع ہوگا، لیکن سُن لیجئے۔ رقص وغنا دونوں نہایت قدیم فن ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ الفاظ کی ایجاد سے پہلے ہی ان دونوں کی بنیاد پڑ چکی تھی رقص نام ہے محض جسم و اعضاء کی جنبش کا اور غنا کا تعلق ہے صرف صوتی لحن سے جس کے لئے الفاظ کی ضرورت نہیں۔

انسان عہد وحشت میں بھی جذبات سے خالی نہ تھا اور چونکہ جذبات کے اظہار میں اعصاب کی جنبش اور جوارح ظاہری کی حرکت قدرتاً ضروری ہے، اس لئے قدیم انسان بھی اپنے جذبات ظاہر کرنے کے لئے جسم اور ہاتھ پاؤں کی جنبش سے کام لیتا ہوگا - جس کی نوعیت جذبات کی نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہوگی۔ یعنی غصہ و ملال یا بوسی و ناکامی، مسرت و انبساط، ان سب کے لئے جدا جدا حرکات سے اس نے کام لیا ہوگا اور وہ حرکات جو خوشی یا جنسی جذبات سے متعلق ہیں بعد کو رقص کہلانے لگیں۔

ظاہر ہے کہ رقص میں مرد و عورت دونوں برابر کی شریک ہوں گی، لیکن رقص کی نوعیت (خصوصیت کے ساتھ جنسی جذبات میں) دونوں کی ایک دوسرے سے مختلف رہی ہوگی اور ہونا چاہئے، کیونکہ مرد کی جو ادائیں عورت کو بھاتی ہیں وہ عورت کی اُن اداؤں سے مختلف ہوتی ہیں، جنھیں مرد پسند کرتا ہے - اسی لئے وہ رقص جس کا تعلق مردانہ جذبات سے ہے، نسائی رقص سے علٰحدہ ہوگیا، کیونکہ اعضاء کی جنبش و حرکت سے نہ عورت مرد بن سکتی ہے نہ مرد عورت - اب اسی کے ساتھ ایک نکتہ اور بھی قابل غور ہے، وہ یہ کہ نہ ہر مرد اس کا اہل ہوتا ہے کہ وہ مردانہ رقص میں کامیاب ہو اور نہ ہر عورت نسائی رقص کے لئے موزوں ہو سکتی ہے۔ مردانہ رقص جس کا تعلق زیادہ تر جذبات حماست و شہامت سے ہے اس کے لئے جسم، اعضاء کی ساخت، خدوخال کی نوعیت بھی خاص ہونا چاہئے، اگر ایک دُبلا پتلا، پست قد، کمزور اور حقیر مرد، بہادرانہ رقص دکھائے گا تو کبھی کامیاب نہ ہوگا، اسی طرح ایک بھدی، بدشکل عورت اپنے رقص میں وہ لوچ پیدا نہیں کر سکتی جو جنسی جذبات کے اظہار کے لئے ضروری ہے۔

اب ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر ادے شنکر کے رقص پر غور کیجئے تو میری طرح آپ کو بھی مایوس ہونا پڑے گا۔ وہ اپنی صورت شکل، قد و قامت، تناسب اعضاء کے لحاظ سے کسی طرح اس کا مستحق نہیں کہ وہ دیوتاؤں کا رقص پیش کر سکے، رہا نسائی رقص، سو اس میں حسین سے حسین مرد بھی کامیاب نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ ادے شنکر۔ اسی لئے میں نے کہا کہ فنی حیثیت سے ممکن ہے وہ ماہر ہو، لیکن اس کی طرف سے اس فن کی نمائش ایک ناکامیاب سوانگ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، اور کلپنا میں بھی اس کا رقص بالکل ایسا ہی تھا، جس سے میں مطلق متاثر نہیں ہوا، تاہم میں نے اس تماشہ کو دو بار دیکھا، لیکن ادے شنکر کے لئے نہیں، بلکہ آوما کے لئے جو صورت و فن دونوں کے صحیح امتزاج کے لحاظ سے یقیناً غیر معمولی مثال ہے۔

اس کا کتابی نقشہ، اس کے خدوخال، اس کا چھریرا جسم، اس کے اعضا کا تناسب، اس کی رعنائی، اسکی آنکھیں

اور ان سب باتوں سے ماورا، اس کی دلکش فطری ادائیں ان چیزوں نے ملکر اس کے رقص کو واقعی اس درجہ سماوی رنگ دیدیا تھا کہ اس کو دو بار دیکھنے کے بعد بھی، ہوسِ دید پوری نہ ہوسکی۔ یونتو اس کی ہر ادائے رقص قیامت تھی، لیکن ایک جگہ رقص کرتے کرتے گردن کو موڑ کر نیموا آنکھوں میں مستی کی خاص کیفیت پیدا کرکے اس نے اپنے ہونٹ کو دانتوں سے دبایا تو ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے دل نکال لیا۔

لب گزیدی دمی از ذوق فتادم مدہوش
با تو کیفیتِ ایں بادہ ندانم کہ چہ کرد

لیکن اس کی خوش ادائی کا ایک معجزہ اس سے بڑھ کر اور بھی میں نے دیکھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ رقص کا تعلق محض حرکات سے ہے۔ لیکن اوما نے ایک جگہ بالکل خاموش، بالکل بے حس حرکت رہ کر یہ بھی بتا دیا کہ بعض اوقات سکوت بھی رقص بنجاتا ہے اور یہ اتنا بلیغ و عمیق رقص ہوتا ہے جسے نگاہیں نہیں بلکہ صرف دل دیکھتا ہے، روح دیکھتی ہے۔

اس تماشہ میں بڑا نقص یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ طویل ہے اور پے در پے اتنے کثیر رمزیہ مناظر پیش کئے گئے ہیں کہ ان کو دیکھ کر پوری طرح سمجھنے کا موقعہ نہیں ملتا اور انسان کا دماغ اُلجھنے لگتا ہے۔ قصہ کی ابتدا بھی بہت غیر دلچسپ ہے اور جس تدریجی مدارج سے اسے عروج تک پہونچایا گیا ہے، وہ بھی کافی اصلاح طلب ہے۔ تاہم فلمی ٹکنک کے لحاظ سے یقیناً بہت کامیاب ہے۔ لیکن پھر بھی کہوں گا کہ اگر اوما اور دوسری چند عورتوں کے رقص کو اس سے خارج کردیجئے تو کلپنا، بھوتوں اور دیوانوں کے سوانگ سے زیادہ کچھ نہیں رہجاتا۔

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کردینے والی

انجیلِ انسانیت

"من و یزداں"

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کرکے تمام نوعِ انسانی کو "انسانیتِ کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحایفِ مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پُرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ ضخامت ۴۷۲ صفحات۔ مجلد۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول

گرد و پوش رنگین — منیجر نگار بک ایجنسی رامپور

باب الانتقاد

روپ میری نظر میں

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

آیئے اب ذرا تفصیل سے ان رباعیوں کا جایزہ لیں :-

ہر جلوے سے اک درس نمو لیتا ہوں — چھلکے ہوئے صد جام و سبو لیتا ہوں
اے جانِ بہار تجھ پہ پڑتی ہے جب آنکھ — سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں

کہنا چاہیے تھا چھلکتے ہوئے جام و سبو، کہا چھلکے ہوئے! مقصود یہ تھا کہ لبریز جام و سبو اور کہا کہ خالی یا قریب قریب خالی جام و سبو اس موقع پر جام و سبو کے ساتھ مدّ کے اضافے کا بھی کوئی تک نہیں، محض وزن پورا کرنے کو لایا گیا۔ البتہ آخری مصرعہ خوب ہے کیا بلحاظ اسلوب اور کیا باعتبار معنی۔ ادھر جذبات کا جزر و مد، اُدھر موسیقی کا اُتار چڑھاؤ۔ دونوں میں یکساں سرخوشی و سرشاری۔ تنوع و ہم آہنگی۔

ابرو ہلتے ہیں یا لچکتی ہے کٹار — یہ روپ کہ رحمتوں کی ہے جیسے چمکار
یہ لوچ یہ دھج یہ مسکراہٹ یہ نگاہ — یہ موج نفس کہ سانس لیتی ہے بہار

روپ کو رحمتوں کی چمکار کہنے سے کوئی نقش دل پر مرتسم نہیں ہوتا۔ چمکار ہونٹوں سے ایسی آواز نکالنا ہے جس کا منشا تسلی یا دلاسا دینا یا بچے سے اظہار محبت کرنا ہے۔ لفظ چمکار سے ایک مخصوص آواز کا مفہوم جدا نہیں کیا جا سکتا۔ روپ کو چمکار دہ بھی ایک نہیں متعدد رحمتوں کی چمکار کہنا لفظاً و معناً غلط ہے۔ علاوہ بریں پہلے مصرع کو باقی مصرعوں سے کوئی ربط نہیں بلکہ تناقض پیدا کرتا ہے، کہاں رحمتوں کی چمکار، جسم کا لوچ، تبسم، نگاہ مہر، انفاس معطر کی بہار آرائی، کہاں کٹار!

دھج کے ساتھ سج کا اضافہ (سج دھج) نہ صرف معنویت بڑھا دیتا بلکہ مصرع کو زبان کی حدوں میں لے آتا۔ مگر فراق صاحب تو لکھنؤ یا دہلی کی زبان کو خاطر ہی میں نہیں لاتے اور یہ اب تک تحقیق نہیں ہوا کہ اُن کی زبان کی ٹکسال کہاں ہے، غالباً انھیں کے دماغ کے کسی گوشے میں محفوظ ہے۔ اس میں ہے بھی بڑی سہولت اور عافیت۔ اعتراض ہوا تو یہ کہکر ٹال دیا کہ "شاعر کی زبان کا مسئلہ دہلی یا لکھنؤ کی زبان سے زیادہ گہرا جاتا ہے"۔

اس رباعی کا بھی آخری مصرع خوب ہے : یہ موج نفس کہ سانس لیتی ہے بہار
انسان کے پیکر میں اُتر آیا ہے ماہ قد یا چڑھتی ندی ہے امرت کی اتھاہ
لہراتے ہوئے بدن پہ پڑتی ہے جب آنکھ رس کے ساگر میں ڈوب جاتی ہے نگاہ

"بدن" یونہی ایک مطعون لفظ ہے، اس پر "لہراتے ہوئے" کا طرّہ وہی مثل ہوئی کہ "ایک تو کڑوا کریلا دوسرے چڑھا نیم!" قد میں بلندی یا اُنچائی کا مفہوم مضمر ہے اس کو ندی سے تشبیہ دینا درست نہیں۔ البتہ قد کو کہتے ہیں کہ باڑھ پر ہے اور ندی میں بھی باڑھ آتی ہے۔ مگر ایک جدید شاعر سے ایسے مبہم اور مبتذل ایہام پر شعر کی بنیاد رکھنے کی توقع نہ تھی۔

قامت ہے کہ انگڑائیاں لیتی سرگم ہو رقص میں جیسے رنگ و بو کا عالم
جگمگ جگمگ ہے شبنستان ارم یا قوس قزح لچک رہی ہے پیہم

سرگم کا انگڑائیاں لینا یا شبنستان ارم کا مطلب میری سمجھ سے باہر ہے۔ لیکن دیکھتے جایئے کہ یہ قامت جو ابھی صرف انگڑائیاں لیتی سرگم ہے فراق صاحب کے صناعتی اور جمالیاتی جادو سے کیا کیا سوانگ بھرتا اور کرتب دکھاتا ہے۔

نظروں کی شعاعوں میں سواتی کی پھوار زلفوں کی گھٹا میں موج ابر کہسار
وہ جانِ وفا تمام دل ہی دل ہے سرتا بقدم بدن ہے آیا ہوا پیار

"بدن" سے فراق صاحب کا پنڈ نہیں چھوٹتا۔ جب سرتا بقدم کہہ دیا تو بدن کی کیا ضرورت رہ گئی ہے۔ نظیری کہتا ہے

ز فرق تا قدمش ہر کجا نظر فگنم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

فراق صاحب نے سواتی کے معنی نیساں تحریر فرمائے ہیں۔ یہ بھی ایجاد بندہ ہے۔ ڈکشنری میں اس کے متعدد معنی ہیں اچھے ستاروں کا قران یا اجتماع۔ ایک نکشتر۔ سورج کی ایک بیوی کا نام۔ تلوار۔ نیساں کا ذکر نہیں۔ البتہ سوات بوند یا سوات (نہ کہ سواتی) پانی یا مینہ کی وہ بوند ہے جو خاص تاریخوں میں (ستمبر تا اکتوبر) اگر سیپی میں گرے تو عام عقیدے کے مطابق موتی بن جاتی ہے۔ ایرانی عقیدے کے مطابق نیساں کی مدت ایک مہینا اکیسویں مارچ تا یکم اپریل سے ہے۔ اس میں اور سوات میں فقط دو کی مشابہت ہے اور یہ مشابہت بھی سوات یا سوات بوند سے ہے نہ کہ سواتی سے۔ ان کو نیساں سے کوئی ربط نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب فراق صاحب سنسکرت میں بالکل کورے ہیں تو انھیں کیا سوجھی ہے کہ سنسکرت الفاظ اُردو میں اٹکل پچو داخل کریں۔ اس طرح نہ تو وہ سنسکرت کی خدمت کرتے ہیں نہ اُردو کی۔

ابر کہسار پر موج کا اضافہ زبان اور واقعیت دونوں سے عدم واقفیت کا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے۔

ہے روپ میں وہ کھنک وہ رس وہ جھنکار کلیوں کے چٹکتے وقت جیسے گلزار
یا نور کی اُنگلیوں سے دیوی کوئی جیسے شب ماہ میں بجاتی ہو ستار

تیسرے مصرعے میں یا کے ہوتے چوتھے مصرع جیسے قطعاً بیکار ہے۔ نہ کرنے سے یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے

روپ ایک کثیر المعنی لفظ ہے، جہاں استعمال ہو قرائن ایسے ہونا چاہئے کہ اس کا مفہوم متعین ہو سکے رباعی سے کچھ واضح نہیں ہوتا کہ یہاں کون سا "روپ دھارا" ہے۔ روپ قد و قامت بھی ہے، چہرہ مہرہ بھی ہے، شکل و شمایل بھی ہے وضع قطع بھی ہے، رنگ ڈھنگ بھی ہے، حسن و جمال بھی ہے، بھیس بھی ہے اور نہ معلوم کیا کیا ہے۔

یہ نقرئی آواز یہ مترنم خواب — تاروں پر پڑ رہی ہو جیسے مضراب
لہجے میں یہ کھنک یہ رس یہ جھنکار — چاندی کی گھنٹیوں کا بجنا تہ آب

یہ مترنم (ت ساکن) ایک صاحب کے مُت بسم کا جواب ہے ورنہ مصرع موزوں نہیں ہوتا۔ میرے کان ایسے سدھے ہوئے نہیں کہ گھنٹیوں کی ٹن ٹن تہ آب سن سکیں۔ معلومات، جلترنگ کی سطح سے نیچے نہ جا سکی مگر آواز اور خواب کی یکجائی نے (آواز لاکھ نقرئی اور خواب مترنم سہی) متخیلہ کے سامنے سوتے میں خراٹے لینے اور بڑانے کا منظر پیش کر دیا اور تہ آب چاندی کی گھنٹیوں کا بجنا اس کے سوا کچھ نہ رہا کہ یہ خراٹے رال بھرے منہ سے نکل رہے ہیں - استغفراللہ!

آواز پہ سنگیت کا ہوتا ہے بھرم — کروٹ لیتی ہے نرم لے میں سرگم
یہ بول سریلے، تھرتھراتی ہے فضا — ان دیکھے ساز کا کھنکنا پیہم

بھرم ہونا اُردو نہیں - یہ مانا کہ بھرم کے معنی گمان کے بھی ہیں مگر اس وجہ سے یہ لازم نہیں کہ جو افعال گمان کے ساتھ لائے جا سکتے ہیں بھرم کے ساتھ بھی لائے جا سکیں۔

گنگا وہ بدن کہ جس میں سورج بھی نہائے — جمنا بالوں کی ان بنسی کی اُڑائے
سنگم وہ کمر کا آنکھ اوجھل لہرائے — تہ آب سرسوتی کی دھارا بل کھائے

چوتھا مصرع ناموزوں .. دھارا اُردو میں مذکر ہے - اس رباعی کی اشاریت بھی نہایت بلیغ ہے - جسم گنگا، بال جمنا، ان دونوں کا سنگم کمر اور کمر کے نیچے سرسوتی بہ رہی ہے! فراق صاحب نے صرف اتنا پردہ رکھ لیا ہے کہ بدن کو گنگا کہا، بالوں کو جمنا کہا مگر اُس چیز کا نام نہیں لیا جسے سرسوتی سے تاویل کیا، یہی غنیمت ہے۔

جب تاروں نے بگھگاتے نیزے تولے — جب شبنم نے فلک سے موتی رولے
کچھ سوچ کے خلوت میں بعد ناز اُس نے — نرم اُنگلیوں سے بند قبا کے کھولے

کہ آؤ، آکاش کے تارو آؤ اور اپنے نیزوں کی بوچھاریں میری چھاتی بوچھ دو: "ڈولے رے ڈولے جوبن کی نیا!"

اب رباعی کی شان نزول پر غور فرمائیے۔ فراق صاحب نے انگریزی کی لائن پڑھی:-

"when the Stars threw down their spears"

تو پسند آئی اور اُردو میں آفاقی کلچر سمونے کے بہانے سے دبا بیٹھے۔ قافیہ فراہم کرنے کو "پھینکے" کو "تولے" میں بدل دیا۔ انگریزی میں دوسری لائن تھی: "And watered heaven with their tears"

کمبخت نقل کرنے والے نے عمدہ شاعری کی مثال میں یہی کپلٹ (Couplet) پیش کیا۔ بڑی اُلجھن کے بعد یہ سوجھی کہ آسمان سے آنسو نہیں بہا سکتے تو نہ سہی شبنم کے موتی رول دو اور رباعی کی تکمیل کیلئے ستاروں کے تنے ہوئے نیزوں کو معشوق کے سینے میں دفن کردو اور بعد ازاں شبنم کے بجائے مگرمچھ کے آنسو رو دو۔ اب یہ اُن کی بلا سوچے کہ ستاروں کے نیزے اور شبنم کے موتی خلوت کدۂ ناز میں کیونکر گھس آئیں گے نگاہ انتقاد میں ایسی تک بندی "بھان متی کے پٹارے" سے زیادہ وقیع نہیں ہو سکتی۔ فراق صاحب نے چکبست مرحوم پر بھی مشق ستم کی ہے۔ اُن کا مطلع ہے ؎

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پُر ضیا کی　　کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

فراق صاحب فرماتے ہیں: "جب کرنیں ہمالیا کی چوٹی گوندھیں"۔ پوری رباعی یہ ہے:

"جب کرنیں ہمالیا کی چوٹی گوندھیں　　سوئے ہوئے آبشار آنکھیں کھولیں
جب کنچن نیر سی جھلکتی ہو فضا　　ایسے میں کاش تیری آہٹ پائیں"

رباعی میں سورج کی کھپت نہیں ہوئی تو صرف کرنوں پر قناعت کی، حالانکہ ہر روشنی میں کرن ہوتی ہے مگر ہر کرن میں تو ہمالیا کی چوٹی گوندھنے کی استعداد نہیں ہوتی۔

یوم چکبست کے موقعے پر میں نے ایک مضمون پڑھا تھا جس میں اس شعر پر بھی تبصرہ کیا تھا:

"اس کی لطافتیں اُس کے دل سے پوچھئے جس نے ہمالیا کے سلسلۂ کوہ پر ہنگام سحر آفتاب کی کرنوں سے سایہ و نور کا تموج اللہ پیچم دخم اور کسی وقت کسی حسین کی کھجوری چوٹی اور بھونرے کی طرح سیاہ چمکیلے ہلکے سے گھونگھرلے ہوئے بالوں کی "رود سمن بو" گندھتے، بل کھاتے اور اُس میں زرتار موباف پڑتے دیکھا ہو۔ ناممکن ہے کہ اس شعر کو پڑھنے کے بعد ہمالیا کا نظارہ اس حسین کی یاد اور اس حسین کا نظارہ ہمالیا کی یاد تازہ نہ کردے اور دونوں صورتوں میں کلیجے پر سانپ نہ لوٹ جائے ——

صرف وہی شاعر ایسی نازک اور دلکش مصوری کر سکتا ہے جو فطرت آشنا دل رکھنے کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کی نفیس معاشرت سے بھی واقف ہو....."

فراق صاحب گورکھپوری کا مصرع پڑھنے کے بعد مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے میرے دعوے کو غلط ثابت کر دیا ایک رباعی کا مصرع ہے: "رہ رہ کے حلق میں جو پپیہے کے پڑیں"

حلق بروزن قلق نظم ہوا حالانکہ صحیح لفظ حلق بروزن فرق یا فاع ہے۔

ایک اور مصرع: "جس طرح حیات کا ہے مرکز رگ جاں"

مرکز کسی دائرے یا نظام کا وسطی نقطہ یا مقام ہے۔ رگ جاں کو مرکز کہنا کسی طرح جائز نہیں۔

بندھ جاتا ہے اک جلوہ و پردہ کا طلسم

بندھ کو جب تک بن نہ پڑھئے مصرع موزوں نہیں ہوتا۔

"کرونٹرارس کی سریلا کوتا ہے بدن"

کرونٹرارس کی سامعہ خراشی کے علاوہ مصرعِ ناموزوں ہے۔ اسی رباعی کے ایک مصرع میں "پیڑا" نظم ہے۔ اسے متھرا کا پیڑا نہ سمجھئے بلکہ ہندی کے پیڑ یا پیرا (درد) کا سنسکرت بدل ہے۔ تاہم فراق صاحب کا دعویٰ ہے کہ سنسکرت الفاظ اس طرح داخل کئے گئے ہیں کہ اردو کی فصاحت کو صدمہ نہ پہونچے!

اس مصرع کی موزونیت کی داد دیجئے : "ہمہ شبنم و گل، تمام رگ و بو ہے"

اور سنئے، بدن چپو ہو گیا :- "چپو چلنا بدن کا کم کم ہلنا"

ایک عجیب و غریب مصرع :- "وہ گات کہ سر سے ایڑیوں تک چمکار"

ایک اور ناموزوں مصرع :- "منہ اٹھائے ہرن کے بچے کومل لوچن"

اس رباعی کا مذاق بلند اور لفظ کلس کا استعمال داد طلب ہے :-

ٹھہری ٹھہری نظریں وحشت کی کرن — چھلکے چھلکے کلس ہیں مدھ کے، جوبن

ماتھے پر سرخ جھلملاتا تارا — کاندھے پر گیسوؤں کا چھایا ہوا گھن

ہندی میں کلس، کلسا اور کلسی سب اودھ ہیں اور بلا تفریق ظرف آب یا چھتر کے معنی دیتے ہیں۔ اردو نے ان سب کو لے کر معنی الگ الگ متعین کر دئے۔ کلس = چھتر، کلسا = ظرف آب، کلسی = کلس کی تصغیر۔ کلسا ظرف آب کی تصغیر "کلسیا" بنالی۔ فراق صاحب اس نازک فرق مفاہیم کو مٹا کر کلس کو دوبارہ ظرف آب یا ظرف شراب بنائے دیتے ہیں۔ یہاں تک تو زبان کا مسئلہ تھا۔ اب ذرا شعر کی نحاکات ملاحظہ فرمائیے۔ جوبن (عورت کے پستان) مدھ (شراب)۔ کے کلس میں جو جھلک رہے ہیں۔ پستانوں سے چھلک سکتا ہے تو ایام رضاعت میں دودھ..... اب یہ اور بات ہے کہ بعض ساون کے اندھوں کو دودھ پر شراب کا دھوکا ہوا اور پی کے مست ہو جائیں۔ یا بدمستی میں پی جائیں!

ہے چشم سیہ کہ تھرتھراتی ہوئی رات — ہے ذوق گنہ کہ جگمگاتی ہوئی رات

ہے زلف کہ پیچ و تاب کھاتی ہوئی رات — رس کے جوبن میں گنگناتی ہوئی رات

عورت کے "ذوق گنہ" میں جنھیں لطف آتا ہے انھیں مبارک رہے۔ "رس کے جوبن" میں رات گنگنائے گی تو کیا، چھپک چھیّا کھیلے گی۔

گھر کی عورت میں بیسوا کی حرکتیں دیکھنا اور ان کو سراہنا فراق صاحب ہی کو زیب دیتا ہے :

"اور سیج پہ بیسوا وہ رس کی پُتلی"

میں پہلی دفعہ پُتلی کو پَتلی پڑھ گیا۔ رس نے دھوکا دیا۔ اسکے جواز میں فرماتے ہیں کہ رفیقۂ حیات کے یہ صفات مہا بھارت میں مرقوم ہیں، مہا بھارت میں اور بہت کچھ مرقوم ہے کہاں تک کلچر کے روپ میں نمایش کیجئے گا۔ اگر یہی "آفاقی کلچر" ہے اور اسی کو

اُردو کا خمیر مایہ بنانے کی ٹھانی ہے تو شما بخیر و ما بسلامت !

کھڑے کی ضو سے دشت ایمن پرنور جوبن کی لو سے جھپکے شمع سرطور
آنکھوں میں گناہ اولیں کی ترغیب رفتار سے لرزے موج صہبائے طہور

عورت گناہِ اولیں یعنی اپنی دوشیزگی تج دینے پر تلی ہوئی ہے، فطرت سوگوار اور ماتم گسار ہونے کے بدلے اسکی تباہ کاری سے جگمگا اُٹھتی ہے۔ دشت ایمن پرنور ہو جاتا ہے، شمع سرطور جھلملانے لگتی ہے، اور موج صہبائے طہور میں تموج پیدا ہو جاتا ہے ! اس مسخرگی اور دریدہ دہنی کا ٹھکانا ہے ؟!

آخری مصرع پر غالب کی روح پچھاڑیں کھاتی اور فریاد کرتی ہے کہ "ہے ہے میرا مصرع ! ہے ہے میرا مصرع ! "لرزے ہے موج ۔ تری رفتار دیکھ کر"۔ دیکھ رہے ہیں آپ "آفاقی کلچر" کا قران السعدین ؟

اور تماشا دیکھئے، کہیں کہیں اسی ہتیلی پر لئے پھرنے والی چھبیلی چنچل نار کو ذوق امرد پرستی نکیلا سجیلا لونڈا بنا کر پیش کر دیتا ہے !

آنکھوں میں وہ رس کہ پتی پتی دھو جائے زلفوں کے فسوں سے مار سنبل سو جائے
جس وقت تو سیر گلستاں کرتا ہو ہر پھول کا رنگ اور گہرا ہو جائے

اسے قلم کی لغزش یا "بول زنانہ، بھیس مردانہ اس صورت کا میں دوانہ" کی تفسیر نہ سمجھئے کیونکہ یہ رباعی بھی دعوت نظر دے رہی ہے :۔

خنکی، یہ رت جگا، یہ بھاری پلکیں شبنم سے دُھلے برگ چمن بھیگی مسیں
تاروں بھری رات کو جماہی آئی روئے عرق آلود پہ لہرائیں لٹیں

"رت جگا" کی یہ لم سمجھ میں آتی ہے کہ ان بھیگی مسوں والے صاحبزادے کی "گود بھری گئی" (کبھی سیل کے کوڑے بھی کھاتے تھے!) برگ چمن کی مہملیت پر لعنت بھیجئے اور پہلے مصرع میں یہ "خنکی" کے بعد چوتھے مصرع میں "روئے عرق آلود" کی بلاغت پر غور کیجئے۔ شاید اس عرق آلودگی کی وجہ شرم ہے اور فراق صاحب نے یہ درس عبرت دینا چاہا ہے کہ یہ لڑکا اُس بے حیا بلبلائی ہوئی لڑکی سے اخلاقاً بہتر ہے جو اپنا کنوارپن بے دھڑک لٹاتی ہے۔

اب کیا پردہ رہ گیا ۔ پیڑو کا اُبھار اور "اُلار" بھی دیکھتے چلئے !

ہے قوس قزح کہ تھرتھراتے بازو رشک فردوس لہلہاتے پہلو
رقصاں شعلہ ہے لچکی لچکی سی کمر کندل پہ کنول ہے یا دمکتا پیڑو

کہیں عرض کر چکا ہوں کہ فراق صاحب نے کندل کے معنی سنہری ڈنٹھل تحریر فرمائے ہیں، کندل کے یہ معنی ہوں کہ نہ ہوں اس میں بلاغت ضرور ہے کیونکہ ڈنٹھل سے پیڑو کی سہیلی "سیلی" کی طرف لطیف اشارہ ہو گیا اور چونکہ کنول کی جڑیں پانی میں ہوتی ہیں ایک خاص چیز تالاب بن گئی ! بازو ست رنگی قوس قزح اور پہلو رشک فردوس کیونکر ہو گئے ؟ یہ باتیں ہلو گ

جو آفاقی کلچر سے ناآشنا ہیں کیا خاک سمجھیں، "کروٹ کروٹ جنت" سے آگے نہ بڑھ سکے۔

ابھی کیا ہے، دیکھتے جائیے کہ فراق صاحب نے اُردو کلچر میں کیا کیا اضافے کئے ہیں:

زلفوں سے فضاؤں کی اداہٹ ہے ہے — جسم رنگیں کی اچپلاہٹ ہے ہے
شوخی ہے کہ گدگدائے جاتی ہے تجھے — ہر عضو بدن کی مسکراہٹ ہے ہے

ہر عضو بدن "مسکیا" رہا ہے یعنی ہر عضو بدن پر "اُدھر" چپکے ہوئے ہیں جو رہ رہ کے منہ چڑاتے ہیں!

ان تین معرکہ آرا رباعیوں میں فراق صاحب ترلوک پر چھا گئے ہیں:

پہلو کی وہ کہکشاں بنتھوں[1] کا اُبھار — ہر عضو کی نرم لو میں دھم جھنکار
ہنگام وصال پینگ لیتا ہوا جسم، — سانسوں کی شمیم اور چہرہ گلنار

کھینچا ہے عبث بغل میں بانہوں کو تولے — کھو جانے کا وقت ہے تکلف نہ رہے
ہنگام وصال کر سنبھلنے کی نہ فکر — سو سو ہاتھوں سے میں سنبھالے ہوں تجھے

اب جو اس پینگ لیتے ہوئے جسم کا ہوا دُکھلتا ہے تو یہ چت اور دہ پٹ!

چڑھتی ہوئی ندی ہے کہ لہراتی ہے — پگھلی ہوئی بجلی ہے کہ بل کھاتی ہے
پہلو میں لہک کے بھینچ لیتی ہے وہ جب — کیا جانے کہاں بہا کے لے جاتی ہے

"کیا جانے" محض تجاہل عارف ہے۔ خط کشیدہ الفاظ صاف صاف بتا رہے ہیں کہ رس کے ساگر میں بھنور پڑ رہا ہے اور یہ حضرت جنھیں شناوری کا بڑا دعویٰ تھا ڈبکیاں کھا رہے ہیں۔ فراق صاحب نے سو سو ہاتھوں کی طرح سو بسوئے "لچکیجا کے" نظم کیا ہوگا۔ کاتب مزے میں آکر بہک گیا اور "لہک کے" لکھ گیا۔

معمولی ندی ہو تو بل کھائے اور معمولی بجلی ہو تو کوندے یا لہرائے، مگر یہ خاص ندی اور خاص بجلی ہے، لہٰذا خرق عادت ضروری تھا، ندی لہراتی ہے اور بجلی بل کھاتی ہے۔ یا پھر فراق صاحب "لہراتی" اور "لہریں لیتی" کا فرق نہیں جانتے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فراق کا منشا نئی کوک شاستر تصنیف کرنا تھا، قانونی شکنجے سے بچنے کو رباعیوں کا روپ دیدیا۔

بی شاعری کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جہاں سنسکرت الفاظ انمل بے جوڑ ہیں فراق صاحب کو ورغلا کر وہی استعمال کرا دئے اور جہاں سنسکرت مرادف مہیرے کی طرح چمکتا عربی کی طرف ڈھال دیا! رباعی یہ ہے:

پیغمبر عشق ہوں سمجھ میرا مقام — صدیوں میں پھر سنائی دیگا یہ کلام
وہ دیکھ کہ آفتاب سجدے میں گرے — وہ دیکھ اُٹھے دیوتا بھی کرنے کو سلام

---

[1] یہ لفظ باوجود سعیِ بسیار پڑھا نہیں گیا نہ ڈکشنری میں ملا۔ فراق صاحب کے اعتبار پر کولا، سُریں۔ رباعی نمبر ۱۴، صفحہ ۵۰

ظاہر ہے کہ لفظ دیوتا کے ہوتے "سلام" سے "پرنام" ہزار درجہ بہتر تھا: "وہ دیکھ اُٹھے دیوتا بھی کرنے پرنام" مگر یہ باتیں "وجدان سیاہ کار" کی اُڑان سے باہر ہیں اور یہ تو رموز فصاحت سے ناآشنا فراق صاحب سمجھ ہی نہیں سکتے کہ "آفتاب سجدے میں گرے" کی جگہ "آفتاب سجدے میں جھکے" کہنے سے حسن معنی و لطف بیان کے علاوہ تخئیل میں صداقت کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔

آیئے اب اس مسموم حلقے سے نکل کر کھلے مرغزاروں کی سیر کریں کیونکہ "روپ" میں چند رباعیاں ایسی بھی ہیں جن میں دراصل حُسن ہے، سادگی ہے، نفاست ہے، لطافت ہے۔ وہ خاص طور پہ دلکش ہیں، جن میں دیہات کی گھریلو زندگی کا عکس ہے۔

وہ گائے کا دوہنا، سہانی صبحیں — گرتی ہیں بھرے تھن سے چمکتی دھاریں
گھٹنوں پہ کلس کا وہ کھنکنا کم کم — یا چٹکیوں سے پھوٹ رہی ہیں کرنیں

قافیوں کی خامی سے قطع نظر صبح کی قید نے دودھ کی دھاروں کو سورج کی کرنوں میں منتقل کر دیا اور اُس ہاتھ کو جو دودھ دوہ رہا ہے پنجۂ خورشید بنا دیا۔ کلس کی کھنک نہ صرف حقیقت ہے بلکہ اس نے منظر میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔

نکھری نکھری نئی جوانی دم صبح — آنکھیں ہیں سکون کی کہانی دم صبح
آنگن میں سہاگنی اُٹھائے ہوئے ہاتھ — تلسی پہ چڑھا رہی ہے پانی دم صبح

آرٹ کا کرشمہ دیکھیے کہ فطری منظر اس پیکر حسن میں اپنی رعنائیاں چھپا کر ذہن سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اب یہی "بھاگ بھری" سہاگن "صبح دمیدہ" ہے جس کے چہرے کی بشاشت، آنکھوں کا سکون اور اطمینان، رات کی میٹھی نیند، دل کی یکسوئی، سارے ستھری معصوم زندگی اور پاک خیالات کا آئینہ ہے۔ پچھلی رباعیوں کے "فیضان گناہ"، "وجدان سیاہ کار" اور دوسرے ہفوات کے پشتاروں سے اس کا تقابل کیجئے۔ کس میں آرٹ اور جاذبیت ہے، کس میں وہ خلوص اور سچی ترنگ ہے جو خواہشات نفسانی کو برانگیختہ کرنے کے بجائے شبستان جمال میں روحانیت کی شمع فروزاں کر دے۔ کس میں عفونت اور گندگی ہے کس میں ترہت اور سنجیدگی ہے۔ کس میں فنی تعمیر کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا، کس میں افسانے کی رنگینیاں حقیقت میں تمثیل ہو گئیں اور ایک کی چھوٹ ایک پر پڑنے لگی؟ خیر اس حکایت کو چھوڑئے، لذیذ سہی۔۔۔۔

تیسرے مصرع میں یہ بات کہی نہیں گئی لیکن "اُٹھائے ہوئے ہاتھ" کا ٹکڑا بتا رہا ہے کہ اس ہاتھ سے نور کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں جس کے پرتو سے تلسی کا مقدس پودا چمکتے ہوئے نور کا شاداب بوٹا بن کر اسپنسر کے "Queen of garden" اور بن جانسن کے (The plant & flower of light) کو شرمانے لگا!

ایک اور تصویر جس کی معصومیت موہن کا من بھی موہ لے!

لہروں میں کھلا کنول نہائے جیسے — دوشیزۂ صبح گنگنائے جیسے
یہ روپ یہ لوچ یہ ترنم یہ نکھار — بچہ سوتے میں مسکرائے جیسے

نوٹ

سوتے بچے کی مسکراہٹ سے تشبیہ نے ہر ادا کو معصوم بنا دیا اور بے ساختگی بھر دی جس میں ترغیب گناہ کی چھاؤں بھی نہیں روپ اور لوچ نے اس دوشیزہ کو کنول کا پھول بنا دیا۔ حسینۂ سحر نے اپنی نغمگی اور اپنا سنگار نچھاور کر دیا کیونکہ اس حسن کی دیوی میں بھرپور جوانی کے باوصف دودھ پیتے بچے کی معصومیت اور سادگی ہے۔

ایسی ہی پُر لطف یہ رباعی ہے:

غنچے کو نسیم گدگدائے جیسے — مطرب کوئی ساز چھیڑ جائے جیسے
یوں پھوٹ رہی ہے مسکراہٹ کی کرن — مندر میں چراغ جھلملائے جیسے

مسکراہٹ کے ساتھ کرن کے اضافے نے کیا کیا گلکاری کی ہے۔

ساز چھیڑ دے کی جگہ ساز چھیڑ جائے نظم ہوا مگر تخیل کی دلبری "بنتی" کرتی ہے کہ "چھما" کرو۔

معصومیِ حسن چھیڑ جائے جس کو — نرمیِ جمال گدگدائے جس کو
کچھ پوچھو نہ ایسی لاجونتی کی حیا — شرماتے ہوئے بھی شرم آئے جس کو

بنیادی خیال کسی ہندی دوہے میں سن چکا ہوں، لیکن اُردو میں بڑے سگھڑاپے سے منتقل ہوا ہے اور اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے

بل کھائی ہوئی کرن ہے نازک قامت — دیپک کی نرم لو سی ہنستی صورت
تارے کی طرح حسین جب ایک ہی ہو — دن ڈوبے جبین آسماں کی زینت

آخری دو مصرعے ورڈزورتھ سے مستعار ہیں:

Fair as a star, when only one
Shining in the sky

اور فراق صاحب نے دوسرے لوٹ مار کے مال کی طرح آفاقی کلچر کی لپیٹ میں انھیں بھی بغیر کسی اعلان کی ضرورت سمجھے اپنے ایوان شاعری کا سامان آرایش بنا لیا، کیونکہ بن جانسن کا فتویٰ موجود ہے کہ شاعری کا ایک اہم جز نقالی ہے اور ارسطو کے علی الرغم دوسرے شاعروں کا سرمایۂ افکار اس نقالی کی سیر گاہ بن سکتا ہے۔

تاہم انصاف یہ ہے کہ ترجمہ بڑی تمیز داری سے کیا گیا ہے اور اس کی پوری قدر اُس وقت ہوگی جب اس کا موازنہ ایک صاحب کے ترجمے سے کیا جائے۔ انکے صاحبزادۂ والاقدر نے جو ایک بلند پایہ نقاد ہیں اپنے والد بزرگوار کی جرأت رندانہ کو اس طرح ے: "کیسی مختصر اور پر اثر ہے یہ تشبیہ:

ایسی چمکی تری تصویر خیالی جیسے — آسماں پر شب تاریک میں تنہا تارا"

شب تاریک کے اضافے نے اصل کی بے ڈھک لطافت کو جو صدمہ پہونچایا ہے اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں مزید برآں ایک لے یہ لفظ جائے اُس کی تصویر خیالی کا مشبہ بہ ہونے سے اس حسین ستارے کی تابندگی میں بہت کچھ فرق آگیا۔ یہ حضرت ایک اور

چال چلے ہیں۔ "اشارات" میں فرماتے ہیں "دیکھو بائرن ٹوآگسٹا" تاکہ پڑھنے والے کا دھیان بٹ جائے اور چوری ڈھکی رہے۔

ایک اور حسین رباعی:

دوشیزہ کرن کلی کو جیسے اُکسائے — رس رنگ سگندھ کے چراغوں کو جلائے
اس چندر مکھی کی مسکراہٹ میں وہ لوچ — شبنم میں کنول کے جیسے کوندا بل کھائے

دوسرے مصرع میں "رس رنگ سُگندھ" کی حلاوت اور بہتی راگنی دل کے پردوں کو چھیڑتی ہوئی خوابیدہ نغمے بیدار کر دیتی ہے۔ چوتھے مصرعے میں غضب کی چکا چوند ہے۔ بجلی کے بدلے کوندا لانا سلیقے پر دال ہے۔ کوندے کی لپک میں بجلی کی تڑپ سے زیادہ شبنم میں حل ہونے کی صلاحیت ہے۔

جوڑے میں سیاہ رات کنڈلی مارے — ماتھے کے عرق میں جھلملاتے تارے
عارض میں سحر کے چھلکے چھلکے ساغر — ٹھوڑی میں قمر کے جگمگاتے پارے

جوڑے میں سیاہ رات کے ساتھ کنڈلی مارنے کے صرف نے سانپ کی تشبیہ کا اضافہ کرکے جوڑے کو اندھیری رات میں گنجینۂ حسن کا محافظ بنا دیا۔ کوئی چوری چھپے آیا نہیں کہ ڈسا گیا، تڑپا اور لہریں لینے لگا۔ میر سوز کی زبان میں، کاٹا نہ ہفی ترا برا ہو!

اس رباعی میں شراب دو آتشہ کے پورے کنٹر کا نقشہ ہے:

راتوں کی جوانیاں نشیلی آنکھیں — خنجر کی روانیاں کٹیلی آنکھیں
سنگیت کی سرحدوں پہ کھلنے والے — پھولوں کی کہانیاں رسیلی آنکھیں

اس میں قافیوں کا حسن ہی نہیں ہے بلکہ ذو قافیتین ہے۔ آخری دو مصرعوں کی تعریف یا شرح ممکن ہی نہیں ان کا کیف وجدانی ہے اور ذوق کو شروتسنیم کی موجوں میں کروٹیں لیتا ہے۔

شاعرانہ آرٹ کی تکمیل اس رباعی میں دیکھئے:۔

خاموش نگاہ کے تکلم کی قسم — اس ساز جمال کے ترنم کی قسم
کلیاں سی چٹک رہی ہیں سینے میں تمام — مہکے ہوئے شبنمی تبسم کی قسم

نگاہ کو ساز جمال اور اُس کی خاموش گویائی کو بربنائے غمازی ترنم کہنا کتنا لطیف و خوشگوار ہے! اس طرح تبسم کے جذباتی اثر کی ترجمانی سینے میں کلیاں چٹکنے سے جس سے دل کی کلی کھلنا محاورے کی طرف نازک اشارہ ہو گیا ایسے تصرفات میں جنکی کماحقہ داد نہیں دی جا سکتی۔

مجموعہ میں اور رباعیاں بھی ہیں جو انتخاب میں آسکتی ہیں، بعض ایسی رباعیاں ہیں جن کے بعض مصرعے اچھے ہیں اور بعض ناقص۔ لیکن کثیر تعداد ایسی رباعیوں کی ہے جن کا نہ ہونا اچھا تھا۔ ان میں خزاں رسیدہ پتوں کی کھڑکھڑاہٹ کے سوا کچھ نہیں۔ یوں کہنا چاہئے کہ "روپ" میں خس و خاشاک زیادہ ہے، پھول کم ہیں، مگر جتنے ہیں اُنکا رنگ چوکھا ہے۔ جعفر علی خاں اثر لکھنوی

مالہ و ماعلیہ

سالنامہ ایوان کے حصۂ منظومات میں پہلی نظم "تنقید" کے عنوان سے جناب علی اختر کی ہے۔ اس نظم میں وہ اپنے حریف (نقاد) کو مخاطب کرکے اپنے اور اس کے ذوق و مرتبہ کا فرق ظاہر کرتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بارہ اشعار کی اس نظم میں ان کے اکثر اشعار نہایت بلند و پاکیزہ ہیں، مثلاً پہلا شعر ملاحظہ ہو:

تجھے خیال کہ ہے رات کی جبیں تاریک　　مجھے یقین کہ یہ بھی ہے موجِ گردشِ رنگ

لیکن اس کے بعض اشعار میری رائے میں نظرِ ثانی کے محتاج تھے۔ چنانچہ نظم کا دوسرا شعر ہے:

تجھے یہ وہم کہ ہے موت زندگی کا مآل　　مجھے یہ علم کہ باطل نہیں زمانۂ ننگ

دونوں مصرعوں میں تطابق نہیں ہے، پہلے مصرعہ کے مفہوم کے لحاظ سے دوسرے مصرعہ میں ظاہر کرنا چاہئے تھا کہ "میرے نزدیک موت مآل زندگی نہیں بلکہ حقیقی زندگی کی ابتدا ہے یا اسی طرح کا کوئی اور مفہوم"۔ ہاں اگر "زمانۂ ننگ" سے "زمانۂ حیات بعد الموت" مراد لی جائے تو بیشک یہ مفہوم پیدا ہو سکتا ہے، لیکن یہ مراد غلط ہوگی۔ کیونکہ ننگ کے معنے عیب، وعار، شرم و حیا اور جنگ و جدل کے ہیں نہ کہ موت یا بعد الموت کے۔

چوتھا شعر ہے:

تجھے بہ ایں ہمہ دانش غمِ زمانۂ تلخ　　مجھے بہ ایں ہمہ کاوش سرورِ بادۂ رنگ

بادۂ رنگ، غلط ترکیب ہے۔ بادۂ رنگیں کی جگہ بادۂ رنگ کہنا درست نہیں۔

پانچواں شعر ہے:

تجھے خیال کہ تعرِ طرب ہے نقش بر آب　　مجھے یقیں کہ صنم آفریں ہے ریزۂ سنگ

پہلے مصرعہ کا معنوی نقص تو یہ ہے کہ اگر شاعر کا حریف تعرِ طرب کو نقش بر آب سمجھتا ہے تو یہ اُس کی بالغ نظری ہے نہ کم فہمی اور اگر مبدا نقش بر آب ہے اور تعرِ طرب خبر، تو مطلق نقش بر آب کہنا کوئی معنی نہیں پیدا کرتا، ضرورت تخصیص کی ہے اور شاعر کو ظاہر کرنا چاہئے کہ وہ کس چیز کو نقش بر آب کہتا ہے۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ وہ، طرب کو جو نقش بر آب چیز ہے، بہت گہری اور پائیدار چیز سمجھتا ہے، لیکن شاعر کا یہ مفہوم مصرعہ سے ظاہر نہیں ہوتا یہ مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا: "تجھے خیال کہ عینِ طرب ہے ظلِ طرب"

دوسرا نقص یہ ہے کہ دونوں مصرعوں میں تطابق بیان نہیں ہے۔ علاوہ اس کے اگر شاعر کے نزدیک ریزۂ سنگ صنم آفریں ہے تو پھر حریف پر کیوں اعتراض ہے اگر وہ نقشِ طرب کو قصرِ طرب سمجھتا ہے۔ شاعر تو ریزۂ سنگ سے صنم تعمیر کر سکے لیکن حریف موج طرب کو طرب پایدار نہ بنا سکے، یہ کیوں؟ — دلیل تو شاعر کے اپنے کسی مفروضہ کی اس نظم میں دی ہی نہیں اس لئے محض دعوے کی حد تک دونوں صحیح ہو سکتے ہیں۔

دسواں شعر ہے:

وہ موج تو ہے کہ جسپر گراں روانیِ سیر　　وہ صید میں کہ جسے خود ہے آرزوئے خدنگ

مصرعوں میں تطابق نہیں ہے۔ دوسرے مصرعہ میں بھی، موج یا متعلقات موج کا ذکر ہونا چاہئے تھا۔ ایک میں موج، دوسرے میں صید، دونوں ایک دوسرے سے غیر متعلق ہیں۔ اگر دوسرا مصرع اس مفہوم کا ہوتا کہ "وہ موج میں کہ جسے محو ہے خواہش طوفاں" تو دونوں مصرعوں میں تطابق ہو جاتا۔

آخری شعر ہے:

پھر اس پہ دعوئے نقد و نظر خدا کی پناہ　　کہاں جمالِ حقیقت کہاں ضمیر گناہ

گناہگار کی جگہ گناہ استعمال کیا گیا ہے۔ ضمیر گناہ بول کر ضمیر گنہگار مراد لینا درست نہیں، ضمیر کے معنے راز کے ہیں اور مجازاً دل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اس لئے اگر دلِ گناہ صحیح نہیں تو ضمیر گناہ بھی درست نہیں ہو سکتا۔ اگر ضمیر کے معنے میلان یا رجحان کے ہوتے تو یہ ترکیب درست ہوتی۔

جگر مرادآبادی

اسی اشاعت میں ایک غزل جگر مرادآبادی کی بھی ہے۔ یہ غزل سات اشعار کی ہے جس میں چار مطلعے ہیں اور چاروں بہت کمزور ——— پہلا مطلع ہے:

رازِ جو سینۂ فطرت میں نہاں ہوتا ہے　　سب سے پہلے دلِ شاعر میں عیاں ہوتا ہے

"سینۂ فطرت کا راز" تک تو صحیح ہے لیکن "نہاں ہوتا ہے" بالکل بیکار ہے۔ دوسرا مطلع ہے:

سخت خوں ریز جب آشوبِ جہاں ہوتا ہے　　نہیں معلوم یہ انسان کہاں ہوتا ہے

اس میں لفظ سخت زاید ہے۔ کیا جب خوں ریزی سخت نہ ہو تو یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ انسان کہاں ہے تیسرے مطلع کا پہلا مصرعہ ہے:

جب کوئی عشق میں برباد جہاں ہوتا ہے

اس میں لفظ جہاں زاید ہے۔ محض مطلع بنانے کے لئے لایا گیا ہے۔ مطلعوں کے علاوہ باقی تین اشعار بہت اچھے ہیں۔ مثلاً:

وقت آتا ہے اک ایسا بھی محبت میں کہ جب　　دل پہ احساسِ محبت بھی گراں ہوتا ہے

کہیں ایسا تو نہیں وہ بھی ہو کوئی آزار — تجھ کو جس چیز پہ راحت کا گماں ہوتا ہے
ہائے وہ سلسلۂ اشک کہ جو تیرے حضور — دل میں رہتا ہے نہ آنکھوں سے رواں ہوتا ہے

ماہر القادری

ایک غزل جناب ماہر القادری کی بھی شایع کی گئی ہے، جس کا ہر شعر (تیسرے شعر کو چھوڑ کر) بہ لحاظ مفہوم تغزل سے علٰحدہ ہے اور اگر کوئی شعر حدود تغزل میں آتا بھی ہے تو طرز ادا نے اسے معیار سے خارج کر دیا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ غزل ماہر صاحب کی ابتدائی مشق کی چیز ہے جسے ایوان نے بغیر ان کی اجازت کے نقل کر دیا ہے۔

عشق نہ تھا تو کچھ نہ تھا محفل کائنات میں — عشق نے جان ڈالدی عالم بے ثبات میں

اس شعر میں غلطی تو کوئی نہیں، لیکن اس قدر بے جان ہے اور اتنی پامال بات اس میں ظاہر کی گئی ہے کہ کسی اچھے شاعر کو اس کی نسبت اپنے سے گوارا نہ کرنا چاہیئے — دوسرا شعر ہے:

ناز ہے گام گام پر شرم ہے بات بات میں — حسن اُلجھ کے رہ گیا رسم تکلفات میں

علاوہ اس کے کہ بہ لحاظ مفہوم شعر بہت معمولی ہے، اس میں ایک معنوی نقص بھی ہے، وہ یہ کہ شاعر کے نزدیک ناز و ادا، شرم و حیا، معشوق کی فطری خصوصیات نہیں ہیں، بلکہ ان کا تعلق رسمی تکلفات سے ہے — چوتھا شعر ہے:

بزم شہود سے بلند ایک جہان اور ہے — صرف نہ کر نگاہ کو صرف مشاہدات میں

اس شعر میں "شاہد و مشہود" کا وہی پامال نظریۂ تصوف پیش کیا گیا ہے، جس میں اب کوئی وزن نہیں رہا۔ ایک اور شعر ہے:

اے دل خوگر صفات کچھ بھی نہیں تری بساط — وہم کا بھی گزر نہیں ان کی حریم ذات میں

اس شعر میں "خوگر صفات" کی ترکیب اس مفہوم کو ظاہر نہیں کرتی جو شاعر کا مقصود ہے — یہاں خوگر، شیفتہ یا فریفتہ کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے جو صحیح نہیں۔ علاوہ اس کے دوسرا نقص یہ ہے کہ دوسرے مصرعہ کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہم (تصور) اور "فریفتگی صفات" دو چیزیں علٰحدہ علٰحدہ ہیں اور اتنی علٰحدہ کہ فریفتگی صفات شاعر کے نزدیک بہ نسبت وہم کے فروتر چیز ہے حالانکہ کسی حقیقت کا تصور بغیر صفات کے تصور کے ممکن نہیں، اور جوہر کے نمود کے لئے عرض کا وجود ضروری ہے۔

ایک اور شعر ہے:

اب میں جہاں کہیں رہوں وہ مرے ساتھ ساتھ ہیں — ان کا خیال گھر گیا میرے تصورات میں

پہلے مصرعہ کے انداز بیان کے لحاظ سے دوسرے مصرعہ میں کہنا چاہیئے تھا کہ "میرے تصورات میں وہ خود بھی گھر گئے"۔

اس غزل میں رات، حیات اور ذات کے ساتھ تکلفات، معاملات، مشاہدات اور تصورات کو بھی ہم قافیہ قرار دیا گیا ہے، جس سے عجز شاعری ظاہر ہوتا ہے، محتاط اور پختہ کار شعراء اس قسم سے بہت بچتے ہیں۔

معلومات عامہ

دُنیا کی سب سے بڑی آنکھ

سب سے بڑی اور قیمتی آنکھ دُنیا پر سب سے پہلی مرتبہ سال گزشتہ کھلی انسانی آنکھ سے اگر اسکا مقابلہ کیا جائے تو سادہ الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ دس لاکھ انسانی آنکھوں کی جگہ صرف یہ ایک آنکھ کافی ہے — یہ دوسو انچہ قطر کا شیشہ رکھنے والی دوربین ہے جس کی طیاری میں بارہ لاکھ پونڈ صرف ہوئے ہیں اور جو کیلی فورنیا کی رصدگاہ میں قایم کی گئی ہے۔ اس کی قوت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ یہ ان ستاروں کو بھی دیکھ سکتی ہے جن کی روشنی ہم تک ایک ارب سال میں پہونچتی ہے یعنی اندازاً ۶۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ میل۔

لڑائی سے قبل اس کی طیاری شروع ہوگئی تھی لیکن دوران جنگ میں اس کو ملتوی کر دیا گیا تھا، اب پھر اس کی تکمیل ہورہی ہے اور بہت جلد فضاء بسیط کی چھان بین شروع ہوجائے گی — اس وقت تک سب سے بڑی دوربین وہ تھی جو مونٹ ولسن پر نصب ہے۔ جس کا شیشہ ۱۰۰ انچہ ہے، لیکن اس دوربین کا شیشہ قوت میں اس سے چوگنا ہے۔

اس دوربین کے ذریعہ سے ہم بتا سکیں گے کہ

۱- آفتاب کیوں روشن ہے اور کیا ہم اس کی حرارت پر قابو پاکر اس سے ایندھن کا کام لے سکتے ہیں یا نہیں۔

۲- کیا واقعی کائنات میں ۲۰ ہزار میل فی سکنڈ کے حساب سے انفجار (Explosion) ہورہا ہے۔

۳- کیا یہ صحیح ہے کہ ہمارا کرۂ زمین روز بروز گرم ہوتا جارہا ہے اور ایک نہ ایک دن اس کو چھوٹے سے سورج میں تبدیل ہوجانا ہے۔

کائنات کا راز معلوم کرنے کی کوشش صدیوں سے ہورہی ہے، چنانچہ سب سے پہلے گلیلیو نے ۱۶۰۹ء میں ایک دوربین طیار کی اور اسکے ذریعہ سے معلوم کیا کہ سیارۂ مشتری کے چاروں طرف متعدد چاند اس کا طواف کرتے رہتے ہیں، اسکے بعد فضائی تحقیق و تفتیش کا سلسلہ برابر جاری رہا، یہاں تک کہ اب انسان اس دوربین کو طیار کرکے کائنات کے بہت سے تاریک گوشوں کو روشنی میں لے آئے گا۔

اس کے شیشہ کا وزن ساڑھے چودہ ٹن (تقریباً ۴۰۰ من) ہے اور جس خول یا نلکی میں سے نصب کیا گیا ہے اس کا وزن ۵۰۰ ٹن ہے، یہ ستر فٹ لمبی ہے اور اس دوربین کو گردش دینے کے لئے ۸۰۰ ٹن وزن کی مشینری لگائی گئی ہے۔

پالومر پہاڑ کی ایک چوٹی پر جسکی بلندی ۶۰۰۰ فٹ ہے اس کو قایم کیا گیا ہے اور اس کے لئے جو عمارت (رصدگاہ) طیار کی گئی ہے اس کا گنبد دس منزل کا ہے۔ اس دوربین کے ساتھ بہت سے دقیق ہندسی آلات تصویر کشی بھی شامل ہیں، جنکی

مدد سے ہم چاند کو جو دو لاکھ چالیس ہزار میل کی دوری پر واقع ہے ہم صرف ۸۰ میل کے فاصلہ سے دیکھ سکیں گے اور اس طرح اس کے متعلق ہم کو بہت سی وہ باتیں معلوم ہو جائیں گی جن کے متعلق اب تک صرف قیاس سے کام لیا جاتا تھا۔

اس دوربین کی طیاری میں سب سے زیادہ مشکل کام ۲۰۰ انچ کے شیشہ کی طیاری کا تھا۔ اس کے ڈھالنے کا کام دسمبر ۱۹۳۴ء میں شروع ہوا تھا اور اس کی رگڑائی اور صیقل کا کام ابتک جاری ہے۔ اس شیشہ کی رگڑائی میں بے انتہا احتیاط سے کام لیا جا رہا ہے کیونکہ اگر ایک انچ کے ۲۰ لاکھویں حصہ کے برابر بھی فرق پڑ جائے تو دوربین بیکار ہو جائے۔ اسکی طیاری کے لئے ۱۵ ٹن کا پنج کو مسلسل تین ہفتہ تک گرم کیا گیا اور جب وہ پگھل کر ۲۸۰۰ درجۂ حرارت تک پہونچ گیا تو سانچہ میں ڈالا گیا اور پورے ایک سال تک اس کو ٹھنڈا ہونے کے لئے چھوڑ دیا گیا، لیکن اس کے ٹھنڈا کرنے کے لئے بھی درجۂ حرارت کو بجلی کی مدد سے آہستہ آہستہ کم کیا گیا ورنہ یوں دفعتاً ٹھنڈا ہونے کی صورت میں اس کے اندر داغ پیدا ہو جاتے۔ یہ شاید کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ سورج۔ چاند اور نظام شمسی کے دوسرے سیارے تو دوربین کے ذریعہ سے بہت بڑے نظر آتے ہیں، لیکن دوسرے ستارے بہت چھوٹے دکھائی دیتے ہیں اور دوربین جتنی بڑی ہوگی، اتنے ہی زیادہ یہ چھوٹے نظر آئیں گے، اس لئے اس دوربین سے ستاروں کے دیکھنے کا کام نہ لیا جائیگا بلکہ اس کی مدد سے ان کی تصویر لی جائے گی اور اس طرح ان کی حالت و حقیقت کے متعلق زیادہ صحیح معلومات حاصل ہو سکیں گی۔

صدیوں کی چوتھی دہائی

آپ تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ہر صدی کی چوتھی دہائی (۴۰ سے ۵۰ تک کی) ہمیشہ منحوس ثابت ہوئی ہے، یعنی ہر صدی کا پہلا حصہ جب ختم ہونے کو ہوتا ہے تو ضرور دنیا میں بےچینی پیدا ہوتی ہے۔ ۱۵۴۰ء میں کیتھولک چرچ کے خلاف پروٹسٹنٹ چرچ کی جنگ شروع ہوئی اور یہ آگ سارے یورپ میں پھیل گئی۔ انگلستان اس وقت مذہبی بغض و عناد اور مذہبی سازشوں کا مرکز تھا اور ہزاروں آدمی بغاوت کے الزام میں سولیوں پر چڑھائے گئے اور یہ بدامنی اور بےچینی ہنری ہشتم کے عہد حکومت کے اختتام تک قایم رہی۔

۱۶۴۰ء میں یورپ میں خانہ جنگیاں شروع ہوئیں یہاں تک کہ ۱۶۴۹ء چارلس اول قتل کیا گیا۔ اس لڑائی نے ملک کو تباہ و برباد کر دیا اور آپس کے اختلافات اس قدر شدید ہو گئے کہ بھائی سے بھائی جدا ہو گیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب جرمنی میں تیس سالہ جنگ جاری تھی۔

۱۷۴۰ء میں فریڈرک اعظم شاہ پروشیا نے سلیشیا اور بوہیمیا کے خلاف جنگ شروع کی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اس کے خلاف ہفت سالہ جنگ کا آغاز ہوا اور فریقین میں سخت خونریزی ہوئی۔

۱۸۴۰ء میں برطانیہ اور آئرلینڈ کی اقتصادی حالت اس قدر خراب ہو گئی کہ لوگ بھوکوں مرنے لگے، قحط، کساد بازاری، غربت و افلاس نے سارے ملک کا نظام درہم برہم کر دیا۔ ۱۸۴۸ء میں پہلا بین الاقوامی انقلاب پیرس میں شروع ہوا، جو اٹلی، جرمنی، آسٹریا، ہنگری اور بوہیمیا تک پھیل گئی۔

۱۹۴۰ء میں جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے اور اسکے خراب نتائج سے اب بھی دنیا دوچار ہے۔

کلامِ مہر اکبر آبادی :

قطعہ

ہزار اُن کی جفاؤں نے کروٹیں بدلیں
سکوتِ غم میں نہ کچھ بھی مرے کمی آئی
وہ میرے پاس سے گزرے جو بے نیازانہ
تو میرے ہونٹوں پہ بے ساختہ ہنسی آئی

جفائیں پہلے وہ آزمالیں۔ سُنا ہے پھر وہ وفا کرینگے
شکستِ ضبطِ غمِ محبت ہوئی نہ پھر بھی تو کیا کریں گے
اگر وہ بھولے سے آ بھی جائیں تو غم کا درماں وہ کیا کرینگے
بڑھے گا اور اضطراب دل کا وہ جب بھی سعیِ وفا کریں گے
بجا یہ پندارِ ضبطِ اُلفت۔ درست عہدِ گریز۔ لیکن
ہماری جانب جو مسکرا کر اُنھوں نے دیکھا تو کیا کریں گے
دبِ گماں ہو اگر ہیں چپ ہم کہ ہیں ابھی محوِ لذتِ غم
ذرا جو یہ بیخودی ہو کچھ کم تو غم میں بھی ہم ہنسا کریں گے
وہ احتیاطِ کرم بھی کرلیں۔ وہ احتیاطِ نظر بھی کرلیں
مگر اُنھیں کی یہ کم نگاہی کرے گی رسوا تو کیا کریں گے
سکونِ دل کی امید میں ہم ابھی تو غم سے اُلجھ رہے ہیں
یہ غم بھی گر زندگی کو اپنی نہ راس آیا تو کیا کریں گے
نہ ترکِ اُلفت ہے اپنے بس میں۔ نہ ربطِ محکم ہی اپنے بس میں
نگاہ و دل کا معاملہ ہے نگاہ و دل فیصلہ کریں گے

کون ؟

از ناظر کامٹوی

زندگانی کی فضا میں دل کو دھڑکاتا ہے کون
جسم کی رگ رگ میں خونِ گرم دوڑاتا ہے کون
گونجتا رہتا ہے دل میں اک ترنم، جاں فزا
بار بار آکر مری نظروں سے ٹکراتا ہے کون
کس کے دم سے ہے رگِ جاں میں محبت کی خلش
روح کی گہرائیوں میں جا کے بس جاتا ہے کون
ہر تڑپ سامانِ فرحت، ہر کسک تسکینِ دل،
مجھ کو اس اندازِ جاں افزا سے تڑپاتا ہے کون
ایک معمولی سی جنبش سے نگاہِ لطف کی
فکر کی اُلجھی ہوئی گتھی کو سلجھاتا ہے کون
جب محبت پر خفا ہوتا ہے ناکامی سے دل
مسکرا کر پیار کے لہجے میں سمجھاتا ہے کون
خواب میں احساس کس کو کھینچ لاتا ہے قریں
آنکھ جب کھلتی ہے تو روپوش ہو جاتا ہے کون

جس کے پیچھے تو نہ ہو ایسا کوئی پردہ نہیں
کونسا رشتہ ترے دامن سے وابستہ نہیں

بیاضِ نیاز

بیدلؔ

یار در آغوش و نامِ او نمی دانم کہ چیست — سادگی ختم ست چوں آئینہ بر لبہائے ما

بدل نقشے نمی بندد کہ با وحشت نہ پیوندد — نمی دانم کدامی بیوفا آئینہ چید اینجا

زاہدی نمی دانم تقوے نمی خواہم — سینہ صافیٔ دارم نذر درد نوشیہا

از ستمدیدگیِ طالعِ من ہیچ مپرس — آنچہ پیشِ تو نگاہ ست خدنگ ست اینجا

ہستی بہ تپش رفت و اثر نیست نفس را — فریاد کزیں قافلہ پرّد جرس را

بیدلؔ من و بیکاری و معشوق تراشی — جز شوقِ برہمن صنمے نیست درینجا

ہر دل نہ برد چاشنی از داغِ محبت — ایں آتشِ نیرنگ نہ سوزد ہمہ کس را

نقابِ عارضِ گل جوشِ کردۂ ما را — تو جلوہ دادی و مدہوش کردۂ ما را

در ہائے فردوس وا بود امروز — از بیدماغی گفتیم فردا

ز نیرنگِ فسوں پردازیِ اُلفت چہ می پرسی — تو در آغوشی و من کشتۂ از دور دیدنہا

از برگ و سازِ قافلۂ بیخودان مپرس — بے نالہ می رود جرسِ کاروانِ ما

مطبوعات موصولہ

سب رنگ اختر الایمان صاحب کا لکھا ہوا ایک منظوم پمفلٹ ہے جس میں مختلف انسانی کرداروں کو جانوروں کے لباس میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ نہ فسانہ ہے، نہ ڈراما، نہ مثنوی ہے، نہ ناٹک، بلکہ یہ کچھ ایسی چیز ہے جسکو نہ ہم نثر کہہ سکتے ہیں، نہ نظم بلکہ یہ ان تمام چیزوں سے علٰحدہ ایک چیز ہے جس کے پڑھنے کے لئے بڑے عزم و استقلال بڑے ضبط و تحمل کی ضرورت ہے اور افسوس ہے کہ میں اس صبر آزما منزل سے گزرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اگر ترقی پسند ادب اور نظم آزاد اسی کا نام ہے، تو "ہذیانات ادب" کسے کہیں گے، اس کا جواب اس کتاب کے پبلشر کے ذمہ ہے۔ جسنے اسے شایع کر کے اپنا روپیہ اور پبلک کا وقت دونوں بُری طرح ضایع کرنا چاہا ہے۔

کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

مسلم سماج ناول ہے فاطمہ ثریا حمیدی کا لکھا ہوا جس میں سرمایہ و عمل کی کشمکش کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا گیا ہے۔ زبان بہت صاف و سلیس ہے، لیکن فنی حیثیت سے یہ نہ ناول ہے نہ فسانہ، بلکہ تبلیغ ہے اسلامی خیالات کی مختلف کرداروں کے ذریعہ سے۔ کتاب مصنفہ کی پہلی کوشش ہے اور زبان و بیان کے لحاظ سے قابل ستایش۔ قیمت تین روپیہ - اس پتہ سے خط و کتابت کی جائے: بنگلہ نواب نثار یار جنگ - حمایت نگر، حیدر آباد (دکن)

گاندھی جی کی باتیں اس کے مولف عبدالحلیم ساحل نے اس کتاب میں مہاتما گاندھی کے اہم واقعات زندگی کے ساتھ ساتھ اُن کے بہت سے اقوال کو بھی یکجا کر دیا ہے اور علاوہ اُن پیامات تعزیت کے جو ان کی وفات پر موصول ہوئے تھے، چند مشاعروں کی نظمیں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ قیمت ۴ر۔ ملنے کا پتہ: مکتبۂ سلطانی بمبئی (۳)

درندے مجموعہ ہے عادل رشید کے آٹھ افسانوں کا جن میں سے چار افسانے ان جذبات سے متعلق ہیں جو ۱۵ اگست ۴۷ء سے قبل مصنف کے دل میں پیدا ہوئے اور چار ۱۵ اگست کے بعد کے جذبات سے متعلق ہیں۔ ان افسانوں کا مقصود اس درندگی پر ملامت کرنا ہے جو حصول آزادی کے سلسلہ میں ہندوستان کے باشندوں کی طرف ظاہر ہوئی ہے۔

عادل رشید نئے لکھنے والے نہیں ہیں، ان کے افسانے کے مجموعے اس سے قبل بھی شایع ہو چکے ہیں۔

قیمت دو روپیہ - ملنے کا پتہ: مکتبۂ سلطانی بمبئی (۳)

ہندوستانی لسانیات کا خاکہ

جان بیمز کا ایک مشہور پمفلٹ ہے جس کا نام "این اوٹ لائن آف انڈین فلالوجی" یہ اسی رسالہ کا ترجمہ ہے جسے پروفیسر احتشام حسین صاحب نے کیا ہے۔ یہ کتاب پانچ ابواب پر منقسم ہے، جن میں ہندوستانی زبانوں کی تقسیم، ان کے مدارج ارتقاء اور خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب موضوع کے لحاظ سے بہت اہم ہے اور بحالاتِ موجودہ جبکہ زبان کے مسئلہ نے سیاسی اہمیت اختیار کرلی ہے، اسکا مطالعہ افادہ سے خالی نہیں۔

ترجمہ تو خیر احتشام صاحب کو اچھا کرنا ہی تھا، لیکن اس سے قطع نظر خود ۵۰ صفحات کا مقدمہ لکھ کر انھوں نے اس کتاب کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ کردیا ہے۔ اس موضوع پر اس سے قبل بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو تحقیقی و تاریخی معلومات اس کتاب سے حاصل ہوسکتی ہیں وہ دوسری کتابوں سے حاصل نہیں ہوسکتیں۔

قیمت دو روپیہ - ملنے کا پتہ: دانش محل، لکھنؤ۔

نوائے دل

مجموعہ ہے جناب ہادی مچھلی شہری کی غزلوں کا۔ ہادی صاحب کی شاعری کا آغاز ۱۹۳۰ء سے شروع ہوتا ہے، جب ان کا کلام تمام مشہور رسایل و جرایدمیں شایع ہونے لگا تھا اور بہت پسند کیا جاتا تھا۔ لیکن اب دس بارہ سال سے انھوں نے اپنے ذوق تغزل کو خود اپنے لئے مخصوص کرلیا ہے اور اپنے کلام کی اشاعت پسند نہیں کرتے۔

ہادی صاحب ان چند شعراء میں سے ہیں، جنھیں ہم صاحب علم کہہ سکتے ہیں اور جو ابتذال و سوقیت کو پسند نہیں کرتے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں اور عام شعراء کی طرح ان کے کلام میں عیوب و اسقام نہیں پائے جاتے، لیکن افسوس ہے کہ یہ مجموعہ اُسوقت شایع ہورہا ہے جب اس رنگ کی شاعری کے قدردان ختم ہوچکے ہیں۔ کتابت، طباعت اور کاغذ نہایت نفیس۔ تقطیع بڑی ضخامت ۲۹۲ صفحات ۔ قیمت سات روپیہ۔

ملنے کا پتہ: کتابستان کملا نہرو روڈ۔ الہ آباد

عینک چھوٹ جائے گی

شرمہ سکسیریم

انکھوں کی بیماریوں کے لئے اکسیر کا کام کرتا ہے۔ انکھوں کی طہارت بہت کم ہوگئی ہو یا فیرینگ کے آپریشن کے آپ کا کام نہیں کرسکتے ہوں اسکے استعمال سے قوت بصارت اتنی پیدا ہوجائے گی کہ چشمہ روز نہیں آئے گا عینک چھوٹ جائے گی۔ بینائی اتنی زیادہ ہوجائے گی کہ دن کو آپ تارے دیکھ سکتے ہیں۔ نزول کے پانی کو بند کرتا ہے اور نزلہ دماغی کو آنے سے روک دیتا ہے نہایت قیمتی اجزاء سے مرکب ہے اور بہت شاندار ہے۔ صدہا انعامات آنکھوں والے ہوئے۔ منجملہ تمام جہانی اعضائے انسانی کی بینائی کم ہوگئی تو آپ کی زندگی بیکار ہے اس لئے کہ تمام دنیا کے کاروبار آنکھوں ہی پر منحصر ہے۔ پھر کیا دیر ہے آج ہی آرڈر دیکر منگا لیجئے ورنہ بعد افسوس ہی پر منحصر ہے۔ پھر کیا دیر ہے آج ہی آرڈر دیکر منگا لیجئے ورنہ بعد افسوس ہی ملنا ہوگا۔

قیمت :- ۶ ماشہ، تین روپیہ (۳ر)

(نوٹ) میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ یہ سرمہ نہایت مفید ہے۔ ہیرا پیٹ خلاق خدا کو نفع پہونچانے کا عام تجربہ کی طرح توڑے گا۔ نیز ہے۔ اب بھی اگر آپ محروم رہیں تو آپ کی قسمت ہے۔

ملنے کا پتہ: حکیم نابت علی بیخ زبان، خوش کلام

(عام شفاخانہ مولوی گنج لکھنؤ (یوپی)

سعید محمود نگر لکھنؤ (یوپی)

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ، علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

۱ چند گمنام فلاسفۂ قدیم کی رد حوں کے ساتھ

۲ مادئین کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس کو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات جو دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے، مثلاً:- مومن، ظفر غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوش اصغر وغیرہ وغیرہ، دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جن کا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔

قیمت حصۂ اول للعہ۔ حصۂ دوم للعہ

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کردینے والی

انجیلِ انسانیت

"من و یزداں"

مولانا نیاز فتحپوری کی ۲۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کرکے تمام نوعِ انسانی کو وحدتِ انسانیت کبریٰ و اخوتِ عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے — اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحایفِ مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پُرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے ——— ضخامت ۲۷۲ صفحات۔ مجلد۔ قیمت سات روپیہ آٹھ آنہ (۷۸) علاوہ محصول

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۹ء
(مصحفی نمبر)
اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- حیات مصحفی - اُردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ - مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں، انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ
قیمت دو روپیہ، علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء
(نظیر نمبر)
اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:- نظیر کا مسلک شاعری پر تبصرہ - نظیر اور عوام - انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۱ء
یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے - یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے -
قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۲ء
اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری سنہ ۴۱ء میں شایع ہوا تھا -
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۳ء
اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی -
قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۵ء
(قرآن نمبر) اس میں ڈاکٹر ٹشڈل کے اُن اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو ماخذ القرآن کے عنوان سے کئے گئے ہیں - حضرت نیاز کے نوٹ اور استدراک کے ساتھ ——— قیمت دو روپیہ علاوہ محصول -

جنوری - فروری مارچ سنہ ۴۶ء
یہ سالنامہ دو حصوں میں شایع ہوا ہے اور فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے - پہلا حصہ جنوری کا ہے اور دوسرے حصہ میں فروری، مارچ دونوں نمبر شامل ہیں - قیمت ہر حصہ کی ایک روپیہ آٹھ آنے

جنوری سنہ ۴۷ء
اس سالنامہ کا نام "ماجدولین نمبر" ہے جس میں ایک بے مثل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اُردو میں منتقل کیا گیا ہے - ادبیت و جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا ——— قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے - علاوہ محصول -

جنوری فروری سنہ ۴۸ء
(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دُنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دُور رزریں اور اُن کارناموں کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومتوں کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی - تمام مقالات اڈیٹر کے قلم کے ہیں ——— قیمت تین روپیہ ——— علاوہ محصول -

نرخنامہ اُجرت اشتہار

ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ ۶۰۰ روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
آدھ صفحہ ۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
چوتھائی صفحہ ۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۴۰ روپیہ	۱۴ روپیہ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر چھ روپیہ - ششماہی جاری نہیں ہوسکتا - سالانہ بیرون ہند بارہ روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہوسکتا ہے ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا - "منیجر"

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجئے - "منیجر"

جواب کیلئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے

مطبوعہ مختار پرنٹنگ ورکس لکھنؤ (پرنٹر و پبلشر:- ایس حسین)